غزلیات میر تقی میرؔ

تشریحات

سبق ۱

غزل ۔۱

تھا مستعار حُسن سے اس کے جو نور تھا
خورشید میں بھی اس ہی کا ذرّہ ظہور تھا
ہنگامہ گرم کن جو دلِ ناصبور تھا
پیدا ہر اک نالے سے شور نشور تھا
پہونچا جو آپ کو تو میں پہونچا خدا کے تیئں
معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا
آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم
یک شعلہ برق خرمن صد کوہِ طور تھا
مجلس میں رات ایک ترے پر توے بغیر
کیا شمع کیا پتنگ ہر اک بے حضور تھا

ق

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آگیا
یکسر وہ استخواں شکستوں سے چور تھا

کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر
میں بھی کبھو کسو کا سرپرُغرور تھا
تھا وہ تو رشکِ حور بہشتی ہمیں میں میؔر
سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنے قصور تھا

....

شعرنمبر(۱)　　تھامستعارحُسن سےاس کےجونورتھا
خورشیدمیں بھی اس ہی کاذرّہ ظہورتھا

مشکل الفاظ:

مستعار	=	اُدھارلینا،ادھارلیاہوا
نور	=	روشنی
خورشید	=	سورج،مہر،آفتاب
ظہور	=	ظاہرہونا،کھلنا،جلوہ

تشریح: اس شعرمیں میؔرمحبوب حقیقی کی تعریف کرتے ہوئے یہ کہہ رہے ہیں کہ عالم میں جوکچھ بھی حسن اورخوبصورتی نظر آتی ہے یاجمال کےمختلف ذرّے نظرآتے ہیں وہ سب خالق حقیقی کےحسن سےمستعارہیں یعنی اُسی سےاُدھارلیاگیا ہےخواہ وہ آفتاب کانورہویاہرذرّےکاجمال ہووہ اُسی کےحسن کاذرّہ ہے۔

سوال نمبر(۲)

ہنگامہ گرم کن جو دلِ ناصبور تھا
پیدا ہر اک نالے سے شور نشور تھا

مشکل الفاظ:

ہنگامہ گرم کن	=	فتنہ وفسادکرنا،شورکرتےرہنا

دلِ ناصبور	=	بے صبر دل
نالے	=	آہ و بکا، فریاد
شورنشور	=	قیامت کا شور، قیامت برپا ہونا، افراتفری

تشریح: جو دل بے صبر ہوتا ہے، محبت و عشق کی آگ برداشت کرنے کا اہل نہیں ہوتا، وہ محبوب سے وصال کی خاطر ہنگامہ آرائیوں میں مصروف رہتا ہے، فتنہ وفساد کھڑے کرتا رہتا ہے۔ اس کی ہنگامہ آرائی شور شرابہ اور فریاد قیامت کا سا ہنگامہ کھڑا کر رکھتا ہے۔

اس شعر کے دوسرے مصرع میں حسن معنی یہ ہے کہ یہاں عاشق کے نالے یا فریاد کو شورِنشور سے تشبیہ دی ہے۔ لیکن یہ تشبیہ صریح نہیں بلکہ تشبیہ بلیغ تخلیق کی گئی ہے جو صریح تشبیہ سے زیادہ ابلغ ہوتی ہے جس سے عاشق کی فریاد میں شدت کا احساس ہوتا ہے۔

شعر نمبر (۳)

پہونچا جو آپ کو تو میں پہونچا خدا کے تیئں
معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا

مشکل الفاظ:

آپ = یہ لفظ یہاں پہلودار ہے۔ آپ سے مراد محبوب مجازی بھی ہوسکتا ہے۔ جو عشق حقیقی یا معرفت محبوب کا سبب بن رہا ہے۔ دوسرا ''آپ'' سے مراد طالب یا شاعر کی اپنی ذات بھی ہوسکتی ہے۔ جسے خود شناسی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

تشریح: اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ میں خدا سے بہت دور تھا یعنی مجھے بہت دیر تک خدا کی معرفت حاصل نہ ہوسکی، لیکن جب میں اپنی ذات میں ڈوب کر ابھرا تو خودشناسی ہوئی جس کے سبب سے میں نے خدا کو پہچان لیا، اس طرح مجھے معرفتِ الٰہی سے قربِ خداوندی حاصل ہوگیا۔ اس شعر کا دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اے محبوب (مرشد) جب میں تیرے در تک پہنچا تو میں خدا کے قریب ہوگیا۔

شعر نمبر (۴)

آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم
یک شعلہ برق خرمن صد کوہِ طور تھا

مشکل الفاظ:

آتش = آگ۔ جذبۂ عشق
کلیم = حضرت موسیٰ علیہ السلام کا لقب، کلام کرنے والا
شعلہ = آگ کی لپٹ، چمک
برق = آسمانی بجلی، صاعقہ
خرمن = اناج کا ڈھیر جس سے بھوسہ الگ نہ کیا گیا ہو
صد کوہِ طور = سو طور کے پہاڑ

تشریح: اس شعر میں تلمیح ہے، میرؔ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تعریض کرتے ہوئے اپنے دل کی کیفیت اور اپنے حال کو بیان کیا ہے۔ پہلے تلمیح سمجھ لیتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ سے کلام کیا کرتے تھے اس لئے ان کا لقب کلیم پڑا۔ ایک بار حضرت موسیٰ علیہ السلام خدا کی بارگاہ میں اس کے دیدار پر اڑ گئے، خدا نے تنبیہ بھی کی آپ میری تجلی کی تاب نہ لا سکو گے، لیکن موسیٰ علیہ السلام پھر بھی دیدار کی ضد کرتے رہے۔ آخر خدا نے اپنے نور کی ایک تجلی طور پر نازل فرمائی تو موسیٰ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑے، میرؔ اس شعر میں موسیٰ علیہ السلام پر تعریض کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے موسیٰ آپ جس محبت کا دعویٰ کرتے ہوئے دیدار کے طالب ہو گئے، وہ محبت ابھی خام تھی ''آتش بلند نہ تھی''، یعنی کہ محبت میں ابھی وہ شدت پیدا نہ ہوئی تھی جو جذبۂ عشق بن کر شعلہ زن ہوتی۔ ہمارے دل کے خرمن میں تو برق کا ایسا شعلہ ہے جو ایک کوہِ طور کیا بلکہ سو کوہِ طور یعنی سینکڑوں کوہ طور کو جلا سکنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

شعر نمبر (۵)

مجلس میں رات ایک ترے پر توے بغیر
کیا شمع کیا پتنگ ہر اک بے حضور تھا

مشکل الفاظ:

پرتو = پرچھائیں،عکس،روشنی،کرن

بے حضور= غائب،کھویا ہوا، بیدل

پتنگ = پروانہ وغیرہ

تشریح: اس شعر کا مطلب ہے کہ اے محبوب رات تُو نہیں تھا تیرا پرتو یعنی عکس بھی نہیں تھا۔جس کی وجہ سے ساری محفل اداس تھی، غیر آباد،اُجڑی ہوئی تھی، کیوں کہ شمع میں تیرا پرتو نہیں تھا،تو نہ شمع تھی نہ ہی اس پر قربان ہونے والے پتنگ اور پروانے تھے،سارا منظر اداس تھا،خرابہ تھا۔

اس غزل کے آخری تین شعر ایک مفہوم واقعہ اور جذبہ کو مکمل کرتے ہیں،اس لئے ان کو ’ق‘ علامت قطعہ سے الگ کیا گیا ہے۔

کل پاؤں ایک کاسۂ سرپر جو آگیا
یکسر وہ استخواں شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر
میں بھی کبھو کسو کا سرِ پُرغرور تھا
تھا وہ تو رشکِ حور بہشتی ہمیں میں میؔر
سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنے قصور تھا

مشکل الفاظ:

کاسۂ سر = سر کی کھوپڑی

یکسر = ایک دم، بالکل

استخوان = ہڈی

شکست = ٹوٹنا،ٹوٹا ہوا

کبھو	=	کبھی
کسو	=	کسی
سر پُرغرور	=	متکبر سر
رشکِ حورِ بہشتی	=	جس پر جنت کی حور رشک کرے
فہم	=	سمجھ

تشریح: اس قطعہ میں میر تقی میرؔ انسان کی اصلیت اور اس کا انجام انسان کو سمجھانا چاہتے ہیں۔ میرؔ نے قطعہ کو ایک واقعہ کی شکل دے کر تکبر کو ٹھکرا کر عاجزی اور انکساری کی طرف انسان کو لانے کی کوشش کر کے اخلاقی پہلو کو اُجاگر کیا ہے۔ کل میں بے خبری اپنے آپ میں گم تکبر کے نشے میں چل رہا تھا کہ اچانک میرے پاؤں تلے کسی مردے کی کھوپڑی آ گئی۔ جس کی ہڈیاں ٹوٹ کر چور چور ہو چکی تھیں، لیکن وہ شکستہ سر زبانِ حال سے بول پڑا کہ اے نادان دیکھ کے چل جس طرح آج تو غرور اور گھمنڈ میں سر اٹھائے چلا جا رہا ہے، نیچے نہیں دیکھتا کہ کوئی مردہ ہے یا زندہ، ایسے ہی میرا حال بھی ہوا کرتا تھا میں بھی غرور میں کسی کی پرواہ نہیں کرتا تھا آج یہ میرا ہے حال کل تیرا حال بھی یہی ہونے والا ہے۔ کل تک اے میرؔ یہ بھی ایسا عزت وشہرت والا تھا کہ جس کے پانے کے لئے جنت کی حوریں رشک کرتی تھیں۔ آج اس حال میں ہے، اس کو دیکھ کر بھی اگر ہمارا حال درست نہ ہو یعنی ہم میں انکساری پیدا نہ ہو تو پھر ہماری سمجھ کا ہی قصور ہے، سبق سکھانے کے لئے تو دلائل بہت ہیں۔

غزل۲

اس عہد میں الٰہی محبت کو کیا ہوا
چھوڑا وفا کو ان نے مروت کو کیا ہوا
امیدوارِ وعدۂ دیدار مر چلے
آتے ہی آتے یارو قیامت کو کیا ہوا
بخشش نے مجھ کو ابرِ کرم کی کیا خجل
اے چشم جوش اشک ندامت کو کیا ہوا
جاتا ہے یار تیغ بکف غیر کی طرف
اے کشتۂ ستم تری غیرت کو کیا ہوا

شعرنمبر(۱)

اس عہد میں الٰہی محبت کو کیا ہوا
چھوڑا وفا کو ان نے مروت کو کیا ہوا

مشکل الفاظ:

عہد = زمانہ
مروّت = لحاظ،اخلاق،انسانیت

تشریح: اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ اے خدا یہ زمانہ، کیسا زمانہ ہے کہ کوئی محبت نہیں کرتا، مان لو کہ انہوں (محبوب) نے وفا نہیں کی، وفاداری کو ترک کر دیا، لیکن کم از انسانیت کا لحاظ تو رکھنا چاہئے تھا، ٹھیک ہے وہ ہم سے محبت نہیں کرتے، وفا نہیں کرتے لیکن دل رکھنے کیلئے، مروّتاً ہی سہی دل کو رکھ لیتے تو کیا ہوتا۔

شعرنمبر(۲)

امیدوارِ وعدۂ دیدار مر چلے
آتے ہی آتے یارو قیامت کو کیا ہوا

مشکل الفاظ:

وعدۂ دیدار	=	جلوہ دکھانے کا وعدہ، وصال کا وعدہ
قیامت	=	دنیا کا فنا ہوکر محشر قائم ہونا۔ یہاں مراد محبوب کی جلوہ آرائی سے عاشقوں کا حال غیر ہونا ہے۔

تشریح: شعر مذکورہ میں گیا ہے کہ محبوب نے دیدار دینے کا وعدہ کیا تھا اور ہم اب تک دیدار کی امید لئے ہوئے ہیں حالانکہ ہماری جان نکل چکی ہے۔ ہم اسی امید پر مرے تھے کہ ہمارے بعد وہ آئے گا تو قیامت برپا ہوگی، ہم نے مر کے بھی دیکھ لیا لیکن قیامت کو کیا ہوا جو اب تک نہیں آئی۔

شعرنمبر(۳)

بخشش نے مجھ کو ابرِ کرم کی کیا خجل
اے چشم جوش اشک ندامت کو کیا ہوا

مشکل الفاظ:

بخشش	=	عنایت، مہربانی، نوالہ
ابرِ کرم	=	رحم و کرم کی بارش، ایسی عنایت جس سے عاشق کی طبیعت ہری بھری ہو یعنی خوش ہوجائے
خجل	=	شرمندگی، حیا
چشم جوش	=	ایسی آنکھ جس میں آنسو چڑھے ہوئے ہوں

اشکِ ندامت=　　شرمندگی کے آنسو

تشریح: مہربانی کی بارش کے عطا کرنے پر میں شرمندہ ہوں، یعنی محبوب ہم سے محبت نہیں کرتا، بلکہ صرف مہربانی کے طور پر مجھ پر بخشش کی ہے (اس سے مرجانا ہی بہتر ہے) اے آنکھ ہمیشہ تو آنسو بہانے کے درپہ رہتی ہے، اکثر تجھ پر آنسوامڈے رہتے ہیں، لیکن آج تیرے وہ آنسو کہاں گئے جو اس حال سے شرمندہ ہوکر برسیں، جس سے میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو۔

شعر نمبر (۴)

جاتا ہے یار تیغ بکف غیر کی طرف
اے کشتۂ ستم تری غیرت کو کیا ہوا

مشکل الفاظ:

یار　=　محبوب
تیغ بکف=　ہاتھ میں تلوار لیے
غیر　=　عاشق کا رقیب
کشتۂ ستم　=　ظلم کے مارے (عاشق)
غیرت　=　خودی، مردانگی، بہادری

تشریح: عاشق محبوب کے واروں سے زخمی ہے، نیم جاں ہے اور محبوب وہی ظلم وستم کی تیغ لئے رقیب کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ایسے حال میں عاشق خود کو ملامت کرتا ہے کہ کیا تو محبوب کے ظلم سہتے سہتے ہار گیا ہے، اب تجھ میں محبوب کے ستم سہنے کی سکت باقی نہیں بچی جو محبوب ہمارے غیر کی طرف تیغ جفا لیے بڑھ رہا ہے، تیری بہادری کو کیا ہوا تیری غیرت کہاں گئی ابھی بھی تو نیم جان ہے، یا تیرا لاشہ پڑا ہے، ابھی بھی اٹھ اور محبوب کے التفات ستم کو اپنی جانب متوجہ کر۔

غزل نمبر۳

الٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا
عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا
ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا
کس کا کعبہ، کیسا قبلہ، کون حرم ہے کیا احرام
کوچے کے اس کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام
کیا
یاں کے سفید وسیہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا یا دن کو جوں توں شام کیا
میؔر کے دین ومذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو!
قشقہ کھینچا ، دیر میں بیٹھا ، کب کا ترک اسلام کیا

شعر نمبر(۱)

الٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا

تشریح: میر تقی میؔر کی زندگی بہت ہی عسرت اور تنگی میں گذری، والد اور والدہ کے انتقال کے بعد جن لوگوں کی رفاقت ملی انہوں نے ظلم وستم کرنے سے حیا نہیں کی، میؔر کے دل پر جو چوٹیں پڑیں، ان کے زخم ہمیشہ میؔر کے دل پر ہرے رہے، ان مصائب سے چھٹکارے کے لیے جتنے حیلے بھی میؔر نے کیے سب بیکار گئے ، اس لئے میؔر یہ کہنے پر مجبور

ہو گئے کہ ہمارا دل جس مرض میں مبتلا ہوا، اُس کے لیے ہر دوا کر ڈالی لیکن جو بھی دوا کی یا تدبیر کی وہ سب الٹی ہو گئیں، کوئی دوا کام نہ آئی آخر کار اسی دل کی بیماری نے ہمارا خاتمہ کر دیا۔ اس شعر کا مرکزی خیال یہی ہے کہ ساری زندگی مصائب سے جوجھتے اور ستم سہتے رہے۔

شعر نمبر (۲)

عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

مشکل الفاظ:

عہدِ جوانی	=	جوانی کا زمانہ
پیری	=	بڑھاپا
آنکھیں موندنا	=	مرجانا
رات	=	یہاں مراد، جوانی کی تلخیاں، جو رات کی طرح سیاہ تھیں
صبح	=	یہاں مراد، موت ہے، جس کی وجہ سے زندگی کی تلخیوں سے چھٹکارا ملا، صبح سے کنایہ ہے آرام کا۔

تشریح: شباب کے زمانے میں جس وقت عیش و آرام کا دور ہوتا ہے، ایسے عالم میں ہم نے زندگی ستم، تکلیف، تنگی، عسرت میں گذاری اور محبت کے لئے ترستے رہے، یہاں تک جوانی آنسو بہاتے کٹی، اور جب بوڑھے ہوئے تو اسی ظلم و ستم میں آنکھیں بند کر لیں یعنی مر گئے، جوانی ہماری سیاہ رات تھی اور موت صبح کی طرح آئی، رات کی تلخیوں سے نجات دلا کر آرام دلایا۔ اس شعر میں میرؔ نے اپنی تباہ حال زندگی کو بیان کرنے کے لئے مبالغہ سے کام لے کر زندگی کی شدت کو پیش کیا ہے۔ شعر میں لف و نشر مرتب کی صنعت کو برتتے ہوئے عہد جوانی کو ''رات'' اور پیری یعنی موت کو ''صبح'' سے تعبیر کیا ہے۔

شعرنمبر(۳)

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

مشکل الفاظ:

ناحق	=	بلاوجہ
تہمت	=	الزام
مختاری	=	اختیار
عبث	=	بے کار
بدنام	=	رسوا

تشریح: مخلوق کی زندگی کی تجربات اور خالق ومخلوق کے مشاہدات سے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ خدا نے ایک طرف ہمیں مختار کہا ہے لیکن اس مخلوق کو خود اپنی مرضی سے کچھ بھی کرنے کا اختیار نہیں، نہ تو زندگی اس کے ہاتھ میں ہے اور نہ ہی موت اس کے قبضے میں، نہ امیری اس کی مرضی پر اور نہ ہی مفلسی کا چارہ اس کی قدرت میں، نہ محبت کرنے کا اختیار اس کے بس میں اور نہ ہی نفرت کرنے کا جذبہ اس کی دسترس میں، یہ سب کچھ تو خدا نے اپنی مرضی اور اختیار میں رکھا ہے، انسان تو مجبور محض ٹھہرا، بلاوجہ مختاری کا الزام انسان کے سر پر رکھ کر اسے رسوا کیا ہے۔ جو چاہتا ہے خدا خود ہی کرتا ہے، اس انسان کو تو صرف عذاب کے لئے دنیا میں بھیج دیا ہے۔

شعرنمبر(۴)

کس کا کعبہ، کیسا قبلہ، کون حرم ہے کیا احرام
کوچے کے اس کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا

مشکل الفاظ:

کعبہ = وہ گھر جسے ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے جبرئیل علیہ السلام کی

نشاندہی کے مطابق مکہ میں تعمیر کیا۔

قبلہ = جس کی طرف مسلمان رُخ کر کے نماز پڑھتے ہیں

حرم = خانہ کعبہ کی مسجد

احرام = وہ کپڑا جس کو مسلمان پہن کر حج اور عمرہ کرتے ہیں یہ سب الفاظ علامت کے طور پر برتے گئے ہیں۔

تشریح: اس شعر میں میرؔ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ، ہم نے ہر طرح کے آدمی کو دیکھا ہے، نمازیوں سے بھی سامنا ہوا، حاجیوں سے بھی ملنے کا شرف حاصل ہوا ہے، حرم کی حرمت بیان کرنے والوں کو بھی دیکھا ہے، لیکن سارے کے سارے اخلاقی خوبیوں سے عاری نظر آئے، مذہب کی دی ہوئی تعلیم پر کوئی عمل کرتا نظر نہیں آیا، بس زبان سے کہنے میں یہ تعلیمات اچھی معلوم ہوتی ہیں عملی اعتبار سے ان کے قریب کوئی بھی نہیں جاتا، میرؔ ''یہیں سے سلام کیا'' کی ترکیب کو برت کر تیکھے ذائقہ کا طنز کرتے ہیں۔

شعر نمبر (۵)

یاں کے سفید وسیہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا یا دن کو جوں توں شام کیا

مشکل الفاظ:

یاں = یہاں، دنیا

سفید وسیہ = روز وشب، اچھا، برا

دخل = اختیار

جوں، توں = جیسا، تیسا

تشریح: میرؔ انسان کے اختیار کو بتا رہے ہیں کہ اس جہان میں ہمارا اختیار بس اتنا ہے کہ ہماری زندگی جیسے بھی روز وشب ہوں، آرام کے یا مصائب کے، یا درد والم کی سیاہ رات آنسو بہاتے بہاتے کاٹے وہیں یا دن کو آہ بکا کر کے

شام تک پہنچاتے ہیں یعنی ہماری زندگی صرف عذاب ہے۔

شعر نمبر(۲)

میؔر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو!
قشقہ کھینچا ، دیر میں بیٹھا ، کب کا ترک اسلام کیا

مشکل الفاظ:

قشقہ = تِلک ،ٹیکا،صندل وغیرہ کا نشان جو ہندو ماتھے پر لگاتے ہیں۔اس سے مراد گنگا جمنی تہذیب کا اشتراک ہے۔

تشریح: اس شعر کے دو مطلب ہو سکتے ہیں،اول طنزیہ،دوم میر کا اپنا مشرب طنز اس معنی کر کہ جو لوگ دین و مذہب کی باتیں کرتے ہیں ان کا اپنا عمل تو ایسا ہے کہ وہ عمل کیا کرتے بلکہ تلک لگا کر دیر میں بیٹھ چکے ہیں علمی اسلام کو تو وہ کب کا چھوڑ چکے ہیں۔معنیٔ دوم یہ ہے کہ میؔر مذاہب کی دوریوں کو پسند نہیں کرتے بلکہ ہندو مسلم تہذیب کو ملا کر ہم نے ایک کر دیا ہے۔یا اسلامی تہذیب کو ہم ہندوستانی تہذیب میں رنگ دیا ہے۔صرف خالص اسلامی تہذیب ہم میں باقی نہیں ہے۔

غزل نمبر ۴

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاجوری کا
کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا
آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت
اسباب لُٹا راہ میں یاں ہر سفری کا
زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا

ہر زخم جگر داور محشر سے ہمارا
انصاف طلب ہے تیری بیداد گری کا
ٹک میرؔ جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسہ ہے چراغ سحری کا

....

شعر نمبر (۱)

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاجوری کا
کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا

مشکل الفاظ:

غرور = گھمنڈ
تاجوری = تاج رکھنے والا، بادشاہ، صاحب اقتدار
نوحہ گری = ماتم

تشریح: میؔر اخلاقی پہلو کو اُجاگر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ زمانہ کے تغیرات ہمیشہ جاری ہیں، یہ دنیا کسی ایک کے پاس رہنے والی نہیں ہے، اس جہاں میں جس کو اقتدار یا بادشاہت حاصل ہوئی اور وہ غرور کے نشے میں چور ہوا، وہ سمجھتا تھا کہ یہ اقتدار، بادشاہت، مستی، یہ عیش ہمیشہ میرے ہی پاس ہے اس کا سر غرور سے نشے میں چور تھا، لیکن پھر قدرت کا نظام الگ ہے کہ ہر گھمنڈ وغرور والے کے سر پر پھر یہاں ماتم بھی ہوتا ہے اور اس کا سب کچھ خاک میں مل جاتا ہے۔

شعر نمبر (۲)

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت
اسباب لُٹا راہ میں یاں ہر سفری کا

مشکل الفاظ:

آفاق = افق کی جمع مراد دنیا

سفری = انسان، مراد انسان دنیا میں مقیم نہیں مسافر ہے

اسباب = سبب کی جمع، مراد، انسان کے مال و دولت، رشتہ دار و احباب، جان وصحبت وغیرہ ہے

تشریح: یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا میں جو بھی آیا ہے وہ مقیم نہیں بلکہ مسافر ہے کیوں کہ اس کو یہاں رہنا نہیں۔ انسان کی اولاً روح تخلیق کی گئی پھر ایک مدتِ دراز کے بعد باپ کی پشت سے ہوتا ہوا ماں کے شکم میں آیا، وہاں سے دنیا میں مختلف منزلوں، بچپن، جوانی اور بوڑھاپا سے گذرا، یہ سفر موت کے بعد بھی محشر تک اس کا جاری رہے گا لیکن ہر وہ کوئی جو دنیا میں آیا تو اس جہاں میں اس کا کوئی سامان سلامت نہیں رہتا۔ نہ ماں و باپ، نہ آل واولاد، نہ رشتہ واحباب، نہ مال و دولت، نہ اقتدار وحیثیت نہ آنکھوں کی خوشحالی، نہ ہڈیوں کا رس، نہ بدن کی تازگی۔ غرض ہر سامان اس مسافر کا اس منزل پر لٹ جاتا ہے۔

شعرنمبر(۳)

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا

مشکل الفاظ:

زنداں = قیدخانہ
شورش = فساد
جنوں = دیوانہ پن
سنگ = پتھر
مداوا = علاج
آشفتہ سری= بددماغی، پاگل پن،سودا

تشریح: میؔر کا کہنا ہے کہ ہمارا جنون ، پاگل پن کا حال یہ ہے کہ ہمارے مہربانوں نے پہلے ہمیں نارمل طور پر رکھا ، ہمارا جنون نہ گیا، ہم قید کھانے میں رکھے گئے تو بھی اس کی دوانہیں اب ہمارے اس پاگل پن، جنون اور سوائی پن کا علاج صرف پتھر ہے، کہیں اس کے ساتھ ہی ٹکرایا جائے تو ہوسکتا ہے یہ آشفتہ سری دور ہو سکے۔

شعرنمبر(۴)

ہر زخمِ جگر داور محشر سے ہمارا
انصاف طلب ہے تیری بیداد گری کا

مشکل الفاظ:

زخم جگر = جگر کا گھاؤ، مرادغم والم
داور محشر = محشر میں انصاف کرنے والا، حاکم
بیدادگری= ناانصافی کرنا

تشریح: ہمیں اتنے دکھ،غم،محرومیاں اورظلم وستم ملے ہیں جن سے ہمارے جگر میں گھاؤ پڑے ہیں، قیامت کے دن انصاف کرنے والے حاکم سے ہمارا ہرزخم جگراس سے انصاف مانگے گا جواس نے جگر پرزخم لگائے ہیں اس کی انصافی کا۔

شعرنمبر(۵)

ٹک میؔر جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسہ ہے چراغ سحری کا

مشکل الفاظ:

ٹک	=	ذرا
جگرسوختہ	=	جلا ہوا کلیجہ، کلیجہ پھُنکا ہوا
چراغ سحری	=	بجھتا ہوا چراغ، بُڑھاپا،ضعیف،قریب المرگ

تشریح: اے میؔر ذرا اپنے بھنے ہوئے کلیجہ کا بھی خیال رکھو، یہ ٹھیک ہے کہ زخم بہت کھائیں ہیں تو نے، غم والم کی برسات ہے تم پر لیکن اتنا زیادہ بھی دل پر نہ لو، ورنہ کچھ معلوم نہیں کہ کب یہ جان چلی جائے، چراغ سحری بجھ جائے۔

غزل ۵

سیر کے قابل ہے دل صد پارہ اس نخچیر کا
جس کے ہرٹکڑے میں ہو پیوست پیکاں تیر کا
سب کھلا باغ جہاں الاّ وہ حیران وخفا
جس کو دل سمجھے تھے ہم سو غنچہ تھا تصویر کا
کیونکہ نقاش ازل نے نقش ابرو کا کیا
کام ہے اک تیرے منہ پر کھینچنا شمشیر کا
رہ گزر سیل حوادث کا ہے بے بنیاد دہر
اس خرابے میں نہ کر فکر تم تعمیر کا
کس طرح سے مانیے یارو کہ یہ عاشق نہیں
رنگ اُڑجاتاہے ٹک چہرہ تو دیکھو میؔر کا

....

شعرنمبر(۱)

سیر کے قابل ہے دل صد پارہ اس نخچیر کا
جس کے ہرٹکڑے میں ہو پیوست پیکاں تیر کا

مشکل الفاظ:

دل صد پارہ = دل کے سوٹکڑے ہونا یعنی چور چور ہونا،نہایت غمگین بے چین، غموں اور دردوں سے بھراہوا

نخچیر = شکارگاہ،شکار،صید

پیکاں = تیر یا برچھی کی آنی

پیوست = گڑھ جانا

تشریح: غزل کا مطلع نہایت درد کے اظہار سے شروع ہوا ہے، میؔر کا کہنا ہے کہ اے سیاحی کرنے والو، تفریح اور شکار سے دل بہلانے والو، آگر تمہیں سیر کرنی ہے تو ایسے دل کا حال دیکھو جس کے شکار گاہ یعنی دل میں سینکڑوں ٹکڑے پڑے ہیں، جس دل کے ہر ٹکڑے میں تیر کی آنی پیوست ہوئی ہے، اس شعر میں درد کی شدت انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔

شعر نمبر (۲)

سب کھلا باغ جہاں الّا وہ حیران وخفا
جس کو دل سمجھے تھے ہم سو غنچہ تھا تصویر کا

مشکل الفاظ:

باغ کھلا = باغ میں ہریالی ہونا، موسم بہار کا منظر
الّا = سوا
حیراں = حیرت زدہ
خفا = ناراض
غنچہ = کلی، گل ناشگفتہ

تشریح: میؔر کہتے ہیں کہ ہماری نظر ہرے بھرے کھلے ہوئے باغ پر پڑی اور وہ باغ دنیا تھا لیکن اُس کے باوجود وہاں کے باشندے حیرت زدہ بھی اور ناراض یعنی تنگ بھی تھے۔ ہم یہ سمجھ رہے تھے جیسی دنیا سجی ہوئی ہے ہمارا دل بھی ویسا ہی ہرا بھرا ہوگا، لیکن جب اُس میں غور کیا تو ہم پر یہ کھلا کہ یہ گل ناشگفتہ کی تصویر ہے۔ اس کی حقیقت کچھ بھی نہیں۔

شعر نمبر (۳)

کیونکہ نقاش ازل نے نقش ابرو کا کیا
کام ہے اک تیرے منہ پر کھینچنا شمشیر کا

مشکل الفاظ:

نقاش ازل = ازل سے نقش بنانے والا، یعنی خدا جو گونا گوں مخلوقات کے نقش خلق

کرتا ہے۔

نقش ابرو = بھوں، یعنی آنکھوں کے اوپر ہلالی شکل کے بال

شمشیر = تلوار، تیغ

تشریح: اس شعر میں میرؔ، حسن تعلیل کے ذریعہ ایک حسین اور پر کیف معنی پیدا کر رہے ہیں کہ نقاش ازل یعنی خدا تعالیٰ خالق نے ازل سے ہی نقاشی کے حسین مرقع تیار کیے ہیں انہیں نقوش میں ایک محبوب کا نقش ابرو ہے، اور اس کے پیدا کرنے کی وجہ یہ ہے کہ آنکھوں کے اوپر یہ ہلالی شکل کا نقش صرف نقش نہیں بلکہ محبوب کے منہ پر یہ شمشیر کھینچے رکھی ہے، جس سے محبوب عاشقوں کو گھائل کر سکیں۔

شعر نمبر (۴)

رہ گزر سیل حوادث کا ہے بے بنیاد دہر
اس خرابے میں نہ کر فکر تم تعمیر کا

مشکل الفاظ:

راہ گزر = راستہ

سیل حوادث = حادثوں کا سیلاب، مصائب کی کثرت

بے بنیاد دہر = بے بنیاد زمانہ، بے حقیقت دنیا، جو دائمی نہ ہو۔

تشریح: اس شعر میں کہا گیا ہے کہ یہ دنیا بے اصل ہے فنا ہونے والی ہے یہاں صرف مصائب دُکھ درد کے سیلاب کے بہنے کی جگہ ہے، لہٰذا ایسے خرابے میں تعمیر و محلات کے بنانے کی فکر بے معنی ہے یہاں کسی کو بھی کچھ معلوم نہیں کہ کب سارا سامان چھوڑ کر اگلی منزل کی طرف بڑھنا پڑھے گا اسی لئے ایک دوسرے مقام پر میرؔ نے کہا ہے۔

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے

شعرنمبر(۵)

کس طرح سے مانیے یارو کہ یہ عاشق نہیں
رنگ اُڑ جاتا ہے ٹک چہرہ تو دیکھو میؔر کا

مشکل الفاظ:

رنگ اڑ جانا = یہ محاورہ ہے، حیران ہونا، پریشان ہونا، اداس ہونا، خوف زدہ ہونا، سودائی

تشریح: میؔر خود کو عشق کے جہاں میں ڈوبے ہونے کو ''رنگ اُڑ جاتا ہے، چہرہ تو دیکھو میؔر کا'' سے ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ایک عاشق کا حال یہ ہوتا ہے، محبت وعشق میں وہ اس قدر غرق ہو کہ وہ دیوانہ لگے پاگل لگے، سودائی معلوم ہو، جگر منہ کو آئے، اے یارو یہ سارے حالات تو میؔر کے چہرے سے ہی ظاہر ہیں، کہ اس کے درد وغم کا اندازا اس کے چہرے سے ہی ہو جاتا ہے، اس کا چہرا ایسا ہے کہ دیکھ کر ہمارا رنگ اُڑ جاتا ہے، خوف لگنے لگتا ہے۔ اس کی دیوانگی تو چہرے سے ٹپکتی ہے تو یارو میں میؔر کو عاشق کیسے نہ مانوں۔

سبق۲

غزل ۶

رنگ اڑ چلا چمن میں گلوں کا تو کیا نسیم
ہم کو تو روزگار نے بے بال وپر کیا
نافع جو تھیں مزاج کو اوّل سو عشق میں
آخر انہیں دواؤں نے ہم کو ضرر کیا
کیا جانوں بزم عیش کہ ساقی کی چشم دیکھ
میں صحبتِ شراب سے آگے سفر کیا
جس دم کہ تیغ عشق کھینچی بوالہوس کہاں
سن لیجئے کہ ہم ہی نے سینہ سپر کیا
وہ دشتِ خوفناک رہاہے مرا وطن
سن کر جسے خضر نے سفر سے حذر کیا

....

شعرنمبر(۱)

رنگ اڑ چلا چمن میں گلوں کا تو کیا نسیم
ہم کو تو روزگار نے بے بال وپر کیا

مشکل الفاظ:

چمن = پھولوں کا باغ
گلوں = گل کی جمع، پھول

نسیم = نرم ولطیف صبح کی ہوا

روزگار = ملازمت، آب ودانا کی فکر

بے بال وپر= بنا بال وپر کے، مراد، دنیاوی ترقیوں کی ساری راہیں مسدود ہو جانا

تشریح: اس غزل کے مطلع میں میرؔ نے کہا ہے کہ اے بادِ صبح، بادِ لطیف چمن میں پھولوں پر خزاں آ چکی ہے، چمن کا حال، بدحال ہے، یعنی پورے ملک میں غیر ملکی شورشوں سے ہر شخص مفلسی کا شکار ہے اور ہمارا تو حال اتنا تباہ حال کہ ہماری تو عزت وآبرو اور ترقی ہی داؤ پر لگی ہے یعنی ہم بے بال و پر ہو چکے ہیں ترقی کی ساری راہیں اور امیدیں مسدود ہو چکی ہیں۔

شعر نمبر(۲)

نافع جو تھیں مزاج کو اوّل سو عشق میں
آخر انہیں دواؤں نے ہم کو ضرر کیا

مشکل الفاظ:

نافع = فائدہ مند، نفع دینے والا

ضرر = نقصان

تشریح: اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں محبت اور عشق کا مزاج کا راس نہیں آیا، ابتدائے عشق میں جو ہمارے مزاج کو دوائیں نفع بخش تھیں، وہی اب ہمارے لئے نقصان دے ثابت ہوئیں ہیں، جن کی وجہ سے جان سے ہاتھ دھونا پڑ رہا ہے۔

شعر نمبر(۳)

کیا جانوں بزم عیش کہ ساقی کی چشم دیکھ
میں صحبتِ شراب سے آگے سفر کیا

مشکل الفاظ:

بزمِ عیش	=	خوشی اور مستی کی محفل
ساقی	=	پلانے والا، مراد محبوب
صحبتِ شراب	=	شراب کی مصاحبت/ ساتھ، مراد چشم محبوب کی توجہ

تشریح: اس شعر میں کہا گیا ہے کہ بزم محبوب میں محبوب کی نشیلی آنکھ کی توجہ سے میں سفر میں آگے نکل گیا، یعنی محبوب کے نین سے اپنے نین کے ملنے کی دیر تھی جوں ہی نشیلے نین کی صحبت حاصل ہوئی تو میں ظاہری پردوں سے آگے نکل کر اسرار و رموز سے واقف ہو گیا۔

شعر نمبر (۴)

جس دم کہ تیغ عشق کھینچی بوالہوس کہاں
سن لیجئے کہ ہم ہی نے سینہ سپر کیا

مشکل الفاظ:

دم	=	وقت
تیغ عشق	=	عشق کی تلوار
بوالہوس	=	ہوس والا
سینہ سپر	=	سینے کو ڈھال بنانا

تشریح: میر کہہ رہے ہیں کہ رقیب کا بھی عجیب حال ہے کہ نفسانی خواہش کا غلام ہوتا ہے لالچی ہوتا ہے، یہ بوالہوس پہلے تو محبت کے دعوے کرتا رہا لیکن جس وقت تیغ عشق کھینچی گئی، عشق پر قربان ہونے کا وقت آیا تو کسی بوالہوس کی ہمت نہیں پڑی کے وہ تیغ عشق کے سامنے آسکے آخر ہم ہی عشق پہ قربان ہونے کے لئے آگے بڑھنے ہمیں نے اپنے سینے کو ڈھال بنایا۔ مطلب یہ ہوا کہ نفسانی خواہش کا غلام عشق نہیں کرسکتا یہ بوجھ وہی اٹھا سکتا ہے جو پاکیزہ عشق کا مزاج رکھتا ہو۔

شعرنمبر(۵)

وہ دشتِ خوفناک رہاہے مرا وطن
سن کرجسے خضر نے سفر سے حذر کیا

مشکل الفاظ:

دشتِ خوفناک	=	خوف زدہ صحرا، جنگل، خرابہ
خضر	=	ایک اللہ کا ایسا بندہ جو صحرانوردی پر مامور ہے، اور خدا کے خاص بندوں کی تربیت کرتے ہیں۔
حذر	=	بچنا، ارادہ ترک کرنا

تشریح: میؔر نے اس شعر میں اپنی حوصلہ مندی کو جتایا ہے کہ ہماراوطن ایسا دشت ناک تھا، ایسا خرابہ تھا جہاں ہم رہے، یعنی جتنے مصائب درد، دکھ، غم محرومیاں دشمنیاں ہم نے دیکھیں ہیں وہ کسی کے حصے میں نہیں آئیں، ہم تو اتنے تنہا ہوگئے کہ وہ دشتِ خوفناک سے کم نہیں کہ جہاں خضر (علیہ السلام) جیسے مردِ خداصحرانوردی کرنے والے بھی سفر کرنے سے بچتے ہیں۔اس شعر میں میؔر نے ایک تلمیح کے ذریعہ اپنے وطن اور گھر کی خوفنا کی کی شدت کو پیش کیا ہے۔

غزل ۷

ہاتھ سے تیرے اگر میں ناتواں مارا گیا
سب کہیں گے یہ کہ کیا؟ ایک نیم جاں مارا گیا
اک نگہ سے بیش کچھ نقصان نہ آیا اس کے تئیں
اور میں بے چارہ تو اے مہرباں مارا گیا
وصل وہجراں سے جو دو منزل ہیں راہ عشق کی
دل غریب ان میں خدا جانے کہاں مارا گیا
جس نے سر کھینچا دیارِ عشق میں اے بو الہوس
وہ سراپا آرزو آخر جواں مارا گیا

....

شعرنمبر(۱)

ہاتھ سے تیرے اگر میں ناتواں مارا گیا
سب کہیں گے یہ کہ کیا؟ ایک نیم جاں مارا گیا

مشکل الفاظ:

ناتواں = کمزور،ضعیف
نیم جان = ادھ مرا

تشریح: غزل کے مطلع میں کہا گیا ہے کہ اے ظالم محبوب اگر میں تیرے ہاتھوں مارا جاتا ہوں تو کوئی تیری بہادری نہیں مانے گا بلکہ اس کے برعکس تجھے سارے بزدل کہیں گے کیوں کہ تو نے کسی بہادر کو نہیں مارا بلکہ ایک ایسے مظلوم کو مارا ہے جو ادھ مرا، کمزور انسان ہے، اس میں تیرا کیا کمال ہے۔

شعرنمبر(۲)

اک نگہ سے بیش کچھ نقصان نہ آیا اس کے تئیں
اور میں بے چارہ تو اے مہرباں مارا گیا

تشریح: اس شعر میں کہا گیا ہے کہ محبوب کی نگاہِ قاتل ایسی تھی کہ اس نے اپنے طرف سے مہربانی کی نگاہ ڈالی اور اس میں صرف اس کا نگاہ کرنے کے علاوہ تو کوئی نقصان نہ ہوا لیکن اس مہرباں نگاہ سے میں بے چارہ مفت میں مارا گیا، میرا تو سب کچھ ختم ہو گیا۔

شعر نمبر (۳)

وصل وہجراں سے جو دو منزل ہیں راہ عشق کی
دل غریب ان میں خدا جانے کہاں مارا گیا

مشکل الفاظ:

وصل = وصال، ملاقات
ہجراں = جدائی، فراق
دل غریب = مسافر دل

تشریح: اس شعر میں وصل اور ہجراں کی دو منزلوں کو کس خوبی کے ساتھ بیان کیا گیا اس کو لفظ میں پیش کرنا ممکن نہیں۔ اس شعر میں کہنا چاہتے ہیں کہ عشق کی راہ میں دو منزل ہیں ایک وصل اور دوسری ہجر، یہ دونوں ایسی کڑی ہیں کہ یہ مسافر دل ان دونوں مسافت کو طے کرتے کرتے مارا گیا اور کبھی ہجر کی منزل سے وصال منزل تک مسافر نہیں پہنچ پایا۔

شعر نمبر (۴)

جس نے سر کھینچا دیارِ عشق میں اے بو الہوس
وہ سراپا آرزو آخر جواں مارا گیا

مشکل الفاظ:

دیارِ عشق = دار کی جمع، علاقہ، ملک، عشق کا علاقہ

سراپا آرزو = خواہشات سے پُر

تشریح: میؔر اس شعر میں نفسانی خواہشوں کے غلام کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ بوالہوس لالچی عشق کرنا آسان نہیں، عشق خواہشوں کی تکمیل نہیں بلکہ جو عشق کے علاقے میں آ گیا، وہ سراپا آرزو تو ہوتا ہے لیکن خواہشوں کا بھوکا نہیں بلکہ عشق میں اس جوان کی جان چلی جاتی ہے۔

غزل ۸

دیر وحرم سے گزرے اب دل ہے گھر ہمارا
ہے ختم اس آبلے پر سیر وسفر ہمارا
دنیا و دین کی جانب میلان ہوتو کہئے
کیاجانئے کہ اس بن دل ہے کدھر ہمارا
جوں صبح اب کہاں ہے طول سخن سے فرصت
قصہ ہی کوئی دم کو ہے مختصر ہمارا
کوچے میں اس کے جاکر بنتا نہیں پھر آنا
خوں ایک دن گرے گا اس خاک پر ہمارا

....

شعرنمبر(۱)

دیر وحرم سے گزرے اب دل ہے گھر ہمارا
ہے ختم اس آبلے پر سیر وسفر ہمارا

مشکل الفاظ:

دیر = نصاریٰ کا عبادت خانہ، گرجا
حرم = مسلمانوں کا قبلہ، کعبہ شریف، یہ دونوں لفظ علامت کے طور پر برتے گئے ہیں۔
آبلہ = چھالہ

تشریح: غزل کے مطلع میں میرؔ کہتے ہیں کہ ہم نے دیر سے لے کر حرم تک سب سفر کرڈالے لیکن کہیں چین میسر نہ آیا آخر دل میں ہی سمٹ کر اپنا گھر کرلیا، اپنی ذات کے خول میں ڈوب گئے، انجام کار دل کے آبلوں پر ہی اپنا سفر اور سیاحی ختم ہوئی۔

شعرنمبر(۲)

دنیا و دین کی جانب میلان ہوتو کہئے
کیا جانئے کہ اس بن دل ہے کدھر ہمارا

تشریح: اس شعر میں کہتے ہیں کہ ہمارے دل کا بھی عجب حال ہے، اس کا میلان نہ تو دنیا کی طرف ہوتا ہے اور نہ ہی دین کی جانب، نہیں معلوم کہ ان دونوں کے علاوہ اور کہاں اٹکا ہے۔

شعرنمبر(۳)

جوں صبح اب کہاں ہے طول سخن سے فرصت
قصہ ہی کوئی دم کو ہے مختصر ہمارا

مشکل الفاظ:

صبح = سویرا، مراد جوانی، شباب ہے
طول سخن = لمبی کہانی
کوئی دم = کچھ ہی دیر

تشریح: اس شعر میں کہا گیا ہے کہ اب کہاں، شباب و جوانی ہے کہ لمبی کہانی کہنے کی فرصت ہو اب تو ہم عشق میں ایسی مات کھائے ہیں کہ نہایت ہی کمزور ہو چکے ہیں۔ اب صرف چند ہی سانسوں کی مختصر کہانی ہے۔

شعرنمبر(۴)

کوچے میں اس کے جا کر بنتا نہیں پھر آنا
خوں ایک دن گرے گا اس خاک پر ہمارا

تشریح: میرؔ غزل کے آخری شعر میں عشق کی فرض شناسی سمجھا رہے ہیں، کہ محبوب کی گلی یا دیار میں جا کر پھر واپس لوٹنا نہیں بن پاتا، ایک تو محبوب کے بنا جینا ناممکن ہے دوسرا فرض عشق کی توہین ہے، اب تو عاشق کا تقاضا یہ ہے کہ محبوب کی گلی کی خاک پر اپنا خون گرائے، یہی عاشق کا سچا ایثار ہے۔

غزل ۹

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا
دل کے جانے کا نہایت غم رہا
حسن تھا تیرا بہت عالم فریب
خط کے آنے پر بھی اک عالم رہا
جامۂ احرام زاہد پر نہ جا
تھا حرم میں لیک نامحرم رہا
میرے رونے کی حقیقت جس میں تھی
ایک مدت تک وہ کاغذ نم رہا
صبح پیری شام ہونے آئی میرؔ
تو نہ چیتا یاں بہت دن کم رہا

شعرنمبر(۱)

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا
دل کے جانے کا نہایت غم رہا

مشکل الفاظ:

دم = سانس،گھونٹ،لہو،وقت

تشریح: غزل کے مطلع میں میرؔ کہتے ہیں کہ، جب تک سانس میں سانس رہی یا جب تک بدن میں لہو رہا، تب تک غموں سے چھٹکارا نہ مل سکا۔ یہاں تک کہ دل غموں سے چور ہو گیا، اور وہ بھی محبوب کے دیار میں چل بسا، اس کے غم نے بھی سر اٹھانے نہ دیا۔

شعرنمبر(۲)

حسن تھا تیرا بہت عالم فریب
خط کے آنے پر بھی اک عالم رہا

تشریح: اے محبوب تیرا حسن و جمال سارے جہاں کو موہ لینا والا تھا، دلکش تھا، تو جہاں سارا عالم فریب میں پھنسا ہوا تھا وہاں میں کب بچ سکتا تھا، یہاں تک کہ تیرا خط آنے پر بھی میری حالت غیر تھی۔

شعر نمبر (۳)

جامۂ احرام زاہد پر نہ جا
تھا حرم میں لیک نامحرم رہا

مشکل الفاظ:

جامۂ احرام = وہ لباس جو مسلمان پہن کر کعبہ کا طواف عمرہ یا حج کی نیت سے کرتے ہیں۔
لیک = لیکن
نامحرم = بے خبر

تشریح: میر کہتے ہیں کہ زاہد نے احرام کا لباس پہنا ہوا ہے اور کعبہ کا طواف کر رہا ہے، یہ نہ سمجھ کے اس کے معرفت الٰہی حاصل ہوگئی ہے، اس کے حال پر تو افسوس ہے کہ حرم میں پہنچ کر بھی بے خبر ہے معرفتِ الٰہی نہیں پا سکا، خدا کی معرفت ظاہر داری سے نہیں بلکہ باطن کو آئینہ کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔

شعر نمبر (۴)

میرے رونے کی حقیقت جس میں تھی
ایک مدت تک وہ کاغذ نم رہا

تشریح: میر اپنا حال بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میرے رونے کی اگر حقیقت تک پہنچنا چاہتے ہو تو اس کاغذ کا حال جانو جس پر میرا قصہ تحریر تھا، میں درد کا مارا روتا ہی رہا، میرے درد کی سکت کاغذ بھی نہ لا سکا اور ایک زمانے تک وہ نم رہا۔

شعرنمبر(۵)

صبح پیری شام ہونے آئی میؔر
تو نہ چیتیا یاں بہت دن کم رہا

مشکل الفاظ:

صبح پیری = صبح گذری، مراد جوانی بیت گئی یا زندگی کا آخری دم آپہنچا
چیتیا = نظر کرنا، معلوم کرنا، دیکھنا
شام = دم آخر، موت

تشریح: اے میؔر جوانی نکل گئی موت آن پہنچی ہے، زندگی کی شام ہو آئی ہے، کیا تو نے دیکھا نہیں، غور نہیں کیا کہ کتنے کم دن تو جیا ہے۔ جو تو جیا ہے، کیا یہ بھی کوئی جینا ہے؟

غزل ۱۰

جو اس شور سے میؔر روتا رہے گا
تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا
میں وہ رونے والا جہاں سے چلا ہوں
جسے ابر ہرسال روتا رہے گا
مجھے کام رونے سے اکثر ہے ناصح
تو کب تک مرے منہ کو دھوتا رہے گا
بس اے گریہ آنکھیں تیری کیا نہیں ہیں
جہاں کو کہاں تک ڈبوتا رہے گا
مرے دل نے وہ نالہ پیدا کیا ہے
جرس کا بھی جو ہوش کھوتا رہے گا
بس اے میؔر مژگاں سے پونچھ آنسوؤں کو
تو کب تک یہ موتی پروتا رہے گا

....

شعر نمبر(۱)

جو اس شور سے میؔر روتا رہے گا
تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

مشکل الفاظ:

شور = بلند آواز

ہمسایہ = پڑوسی

تشریح: اے میرؔ اتنی بلند آواز سے مت رو، اگر تو اتنی آواز سے روئے گا تو پڑوسی بھی سو نہیں پائے گا۔

شعر نمبر(۲)

میں وہ رونے والا جہاں سے چلا ہوں
جسے ابر ہر سال روتا رہے گا

تشریح: میرؔ ساری زندگی غم زدہ رہے ہیں، ان کی شاعری کا بیشتر حصہ اس مضمون پر مشتمل ہے جس میں وہ اپنے غم، دُکھ، ظلم وستم کو آنسوؤں کے پردے میں پیش کرتے ہیں، اسی کا تسلسل اس غزل میں بھی موجود ہے، میرؔ کہتے ہیں کہ میں دنیا میں ایسا رونے والا گذرا ہوں کہ اگر ہر سال ابر روتا رہے تو بھی میرؔ کے رونے کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس شعر میں صنعت مبالغہ کو برت کر میرؔ نے اپنے درد کی شدت کا احساس دلایا ہے۔

شعر نمبر(۳)

مجھے کام رونے سے اکثر ہے ناصح
تو کب تک مرے منہ کو دھوتا رہے گا

تشریح: اس شعر میں میرؔ کے اس اسلوب کے مطابق ناصح صرف نصیحت نہیں کرتا کہ نہ رو بلکہ ہمدردی کا مظاہرہ کرتا ہے، بار بار میرؔ کے آنسو صاف کرتا ہے، لیکن میرؔ ناصح سے کہتے ہیں کہ تو کتنی بار میرے منہ کو دھوتا رہے گا میرے درد اتنے ہیں کہ یہ آنسو بند ہونے والے نہیں۔ لہٰذا تو بھی بار بار زحمت نہ اٹھا۔

شعر نمبر(۴)

بس اے گریہ آنکھیں تیری کیا نہیں ہیں
جہاں کو کہاں تک ڈبوتا رہے گا

تشریح: اس شعر میں میرؔ گریہ کو انسانی تلازمہ دے کر مجسم بنا کر اُس سے مخاطب ہیں کہ گریہ کیا تیری آنکھیں نہیں تو دیکھ نہیں رہا کہ تو اتنا بہہ رہا ہے کہ پورے جہاں کو ڈبو دیا ہے جو کچھ تھوڑا رہ گیا ہے اس کو تو ڈوبنے سے بچا لے۔ اس شعر

میں مبالغہ سے کام لیا گیا ہے، تا کہ ہمدردی کی شدت کا احساس ہو سکے۔

شعر نمبر (۵)

مرے دل نے وہ نالہ پیدا کیا ہے
جرس کا بھی جو ہوش کھوتا رہے گا

مشکل الفاظ:

نالہ = فریاد
جرس = گھڑیال، گھنٹہ

تشریح: میری فریاد اس قدر اونچی اور ترنم ریز ہوگئی ہے کہ جس کی آواز حالانکہ بڑی بلند ہوتی ہے جو کوچ کا نقارہ بجاتی ہے اس کے باوجود میرے نالہ کو سن کر وہ بھی آپے سے باہر ہو چکی ہے یہاں تک جرس بھی ہمیشہ بے ہوش ہوتا رہے گا۔

شعر نمبر (۶)

بس اے میؔر مژگاں سے پونچھ آنسوؤں کو
تو کب تک یہ موتی پروتا رہے گا

مشکل الفاظ:

مژگاہ = مژہ کی جمع پلک
موتی پرونا = مراد قیمتی پانی، آنسو

تشریح: آخر شعر میں خود کلامی کے اسلوب میں میؔر خود کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اے میؔر اب رونا بند کرو پلکوں سے آنسو پونچھ ڈالو، آخر رو رو کر یہ قیمتی پانی، جو موتیوں سے گراں قدر ہے، کب تک بہا کر نڈھال ہوتا رہے گا۔

سبق۳

غزل ۱۱

ہر آن تھی سرگوشی یا بات نہیں گاہے
اوقات ہے اک یہ بھی اک وہ بھی زمانا تھا
پامالی عزیزوں کی رکھنی تھی نظر میں ٹک
اتنا بھی تمھیں آکر یاں سر نہ اٹھانا تھا
اک محو تماشا ہیں اک گرم ہیں قصے کے
یاں آج جو کچھ دیکھا سو کل وہ فسانا تھا
کیونکر گلی سے اس کی میں اٹھ کر چلا جاتا
یاں خاک میں ملنا تھا لوہو میں نہانا تھا
کیا صورتیں بگڑی ہیں مشتاقوں کی ہجراں میں
اس چہرے کو اے خالق ایسا نہ بنانا تھا
مت سہل ہمیں سمجھو پہنچے تھے بہم تب ہم
برسوں تئیں گردوں نے خاک کو چھانا تھا
کہتا تھا کسو سے کچھ تکتا تھا کسی کا منہ
کل میرؔ کھڑا تھا یاں سچ ہے کہ دوانا تھا

....

شعرنمبر(۱)

ہر آن تھی سرگوشی یا بات نہیں گاہے
اوقات ہے اک یہ بھی اک وہ بھی زمانا تھا

مشکل الفاظ:

ہرآن	=	ہرلمحہ، ہروقت
سرگوشی	=	کان میں آہستہ راز داری سے بات کرنا
گاہے	=	کبھی
اوقات	=	حیثیت، درجہ، حالت

تشریح: میؔر کی یہ غزل بنا مطلع کے ہے، اس شعر میں میؔر اپنے محبوب سے قربت کے تعلقات کو بھی پیش کرتے ہیں، پھر محبوب سے دوری کتنی ہوگئی اس حال کا بھی ذکر کر کے افسوس کرتے ہیں۔ ایک وقت وہ تھا کہ محبوب سے ہمیں اتنی قربت حاصل تھی کہ محبوب کے ہم نشین ہوکر ہمراز بن کر سرگوشی میں گفتگو کیا کرتے تھے اور کبھی ایسا بھی وقت آن پہنچا کہ قربت تو قربت کیا کبھی بات تک نہیں ہوتی، ایک وقت میں ہماری کیسی قدر دانی تھی اور ایک آج ہم کس حیثیت کو پہنچ چکے ہیں ''اوقات ہے اک یہ بھی ایک وہ بھی زمانا تھا''

شعرنمبر(۲)

پامالی عزیزوں کی رکھنی تھی نظر میں ٹک
اتنا بھی تمہیں آ کر یاں سر نہ اٹھانا تھا

مشکل الفاظ:

پامالی	=	بربادی
عزیز	=	پیارا، اپنا
ٹک	=	ذرا

تشریح: اس شعر میں کہا گیا ہے کہ اے میرؔ تم اس دنیا میں تو آئے لیکن اتنے اپنی ذات میں ڈوب گئے کہ سر اٹھا کر کسی کو دیکھا تک بھی نہیں، کم از کم اپنے پیاروں، عزیزوں کی بربادی پر تو ذرا نظر رکھنی چاہئے تھی۔

شعر نمبر (۳)

اک محو تماشا ہیں اک گرم ہیں قصے کے
یاں آج جو کچھ دیکھا سو کل وہ فسانا تھا

مشکل الفاظ:

محو تماشا	=	کھیل کود یا دل بہلانے میں گم
گرم ہیں قصے	=	کہانی کہنے میں مصروف
فسانا	=	فرضی بات، کہانی

تشریح: ہمارا حال برباد ہے لیکن بعض لوگ ایسے ہیں جو ہماری بربادی کو تماشا بنائے ہوئے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو ہماری بربادی کو مزے مزے لے کر کہانی کے طور پر بیان کرنے میں سرگرم ہیں۔ ہمارے یہاں جو آپ آج حقیقت کے طور پر دیکھ رہے ہیں یہ کبھی فرضی کہانی کے طور پر دل بہلانے کے لئے لوگ سنا کرتے تھے۔

شعر نمبر (۴)

کیونکر گلی سے اس کی میں اٹھ کر چلا جاتا
یاں خاک میں ملنا تھا لوہو میں نہانا تھا

تشریح: اس شعر میں میرؔ عشق کے تقاضے کا خیال رکھتے ہوئے کہتے ہیں، ناصح مجھے کہتے ہیں کہ تو محبوب کی گلی میں کیوں چلا گیا، اگر گیا بھی تھا تو واپس لوٹ ہی آنا چاہئے تھا، لیکن میں کہتا ہوں کہ میں کیوں کر اور کیسے محبوب کی گلی یا اس کے دیار سے واپس لوٹتا، میں واپس لوٹنے یا جان بچانے کے لئے نہیں آیا تھا، بلکہ میں تو محبوب کے کوچے کی خاک میں خود کو ملانے آیا ہوں، اس کے کوچے کی مٹی میں اپنے خون کو بہا کر نہانے آیا ہوں جو ایک عاشق کا شیوہ ہوتا ہے۔

شعر نمبر(۵)

کیا صورتیں بگڑی ہیں مشتاقوں کی ہجراں میں
اس چہرے کو اے خالق ایسا نہ بنانا تھا

مشکل الفاظ:

مشتاقوں	=	مشتاق کی جمع، چاہنے والا
ہجراں	=	جدائی، فراق
خالق	=	پیدا کرنے والا

تشریح: اس شعر میں میرؔ خدا سے مخاطب ہے، کہ خالق تو نے ، اتنی حسین شکلیں کیوں بنائیں، تو نے یہ پری چہرے ، پرُ جمال محبوب کو کیوں پیدا کیا، اگر تو ایسی تخلیق نہ کرتا تو عاشقوں، چاہنے والوں کا حال ان کی جدائی کے سبب برباد نہ ہوتا، جتنا تو نے محبوبوں کے چہرے حسین بنائے ہیں اتنے ہی چاہنے والوں کی صورتیں بے قاعدہ ہوگئیں ہیں بگڑ گئیں ہیں۔

شعر نمبر(۶)

مت سہل ہمیں سمجھو پہنچے تھے بہم تب ہم
برسوں تیئں گردوں نے خاک کو چھاناتھا

مشکل الفاظ:

سہل	=	آسان، کم حیثیت، کم درجہ
بہم	=	مسلسل
برسوں	=	کئی سالوں
گردوں	=	آسمانوں
خاک چھاننا	=	محاورہ، سخت محنت کرنا

تشریح: اس شعر میں میرؔ انسان کی حیثیت کو ظاہر کرتے ہیں کہ یہ کوئی عام مخلوق نہیں کہ بڑی آسانی سے پیدا ہوگئی، انسان بننا پھر ہمارے مرتبے تک پہنچنا یہ کوئی کھیل نہیں بلکہ ساتوں آسمانوں کی مسلسل جدوجہد اور خاک چھاننے کے بعد یہ وجود میں آیا ہے اور اس مرتبے پر پہنچا ہے جس پر ہم ہیں، ایک دوسرے مقام میرؔ اسی مضمون کو اس طرح ادا کرتے ہیں

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

شعر نمبر (۷)

کہتا تھا کسو سے کچھ تکتا تھا کسی کا منہ
کل میرؔ کھڑا تھا یاں سچ ہے کہ دوانا تھا

تشریح: آخری شعر میں میرؔ اپنے سودائی پن، اپنے خراب اور ابتر حالت کو بیان کرتے ہیں کہ کل ہی کی بات ہے کہ میں کبھی کسی کو کچھ کہتا تھا، کبھی کسی کو عجیب طرح سے دیکھتا تھا میرؔ کا حال عجیب سا تھا، سچ ہے کہ وہ دیوانہ بن کر کھڑا تھا۔ جس کو ہر کوئی پاگل سمجھتا تھا۔

غزل ۱۲

رہے بدحال صوفی حال کرتے دیر مجلس میں
مغنّی نے سنا مصرع جو میرے شعر حالی کا
نظر بھر دیکھتا کوئی تو تم آنکھیں چھپا لیتے
سماں اب یاد ہوگا کب تمہیں وہ خورد سالی کا
چمک یا قوت کی چلتی ہے اتنی دیر کاہے کو
اچنبھا ہے نظر بازوں کو ان ہونٹوں کی لالی کا
دماغ اپنا تو اپنی فکر ہی میں ہوچکا یکسر
خیال اب کس کو ہے اے ہم نشیں نازک خیالی کا

....

شعرنمبر(۱)

رہے بدحال صوفی حال کرتے دیر مجلس میں
مغنّی نے سنا مصرع جو میرے شعر حالی کا

مشکل الفاظ:

بدحال	=	تباہ حال
صوفی حال	=	دیوانہ وار حالت، سادہ زندگی، ہوس سے خالی زندگی
مغنّی	=	گانے والا، گویا
شعرحالی	=	میری حالت کا شعر

تشریح: اس شعر میں میؔر کہتے ہیں، میری حالتِ غیر پر جو کہا ہوا شعر تھا اُس کا مصرعہ جب مغنّی نے سنا، تو کلیسائی مجلس میں صوفیانہ حالت کا مظاہرہ کرر ہا تھا۔ میرے شعر حالی سے اس کی حالت ہی بد ہوگئی کہ وہ خود دیوانہ لگنے لگا۔

شعر نمبر (۲)

نظر بھر دیکھتا کوئی تو تم آنکھیں چھپا لیتے
سماں اب یاد ہوگا کب تمہیں وہ خورد سالی کا

مشکل الفاظ:

سماں = منظر
خوردسالی = کم سنی، بچپن

تشریح: میؔر محبوب کی کم سنی کی حیات کو ذکر کرتے ہوئے محبوب سے مخاطب ہیں، اے محبوب ہمیں تو تمہارہ وہ زمانہ یاد ہے جب تم بڑے باحیا، اور سرپا شرافت تھے، اگر کوئی تمہیں نظر بھر کر دیکھ لیتا تھا تو تم آنکھیں چھپا لیتے تھے، لیکن اب تو تم اداؤں کی نمائش میں مگن ہو، اب تم پینترے بدل بدل وار کرتے ہو، وہ بچپن کا منظر یاد کرو شاید تمہیں وہ کم سنی کا زمانا یاد آجائے۔

شعر نمبر (۳)

چمک یاقوت کی چلتی ہے اتنی دیر کاہے کو
اچنبھا ہے نظر بازوں کو ان ہونٹوں کی لالی کا

مشکل الفاظ:

یاقوت = جواہرات کی ایک قسم، قیمتی موتی
اچنبھا = عجوبہ

تشریح: شعر مذکور میں میؔر حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ نظر باز جو محبوب کے ہونٹوں کی لالی کے دھوکے میں آئے ہوئے ہیں ان پر تعجب ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ سب فریب ہے کیوں کہ یاقوت کی چمک دیر تک نہیں چلتی

بلکہ کبھی پھیکی بھی پڑ جاتی ہے۔

شعرنمبر(۴)

دماغ اپنا تو اپنی فکر ہی میں ہوچکا یکسر
خیال اب کس کو ہے اے ہم نشیں نازک خیالی کا

مشکل الفاظ:

یکسر = ناگہاں، ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک سارا کا سارا، بالکل

ہم نشین = ہم جلیس، ساتھ بیٹھنے والا

نازک خیال= باریک اور نازک خیال

تشریح: شعر مذکور میں کہا گیا ہے کہ جب ہم اپنی فکر اور روزگار کی مصیبت میں پھنسے رہیں گے کچھ سوچنے کا موقعہ ہی نہیں ملے گا تو دماغ بالکل بیکار ہو جائے گا، پھر کہاں سے ہم خیال کی نزاکتوں کی تلاش میں رہے گے یا بلند خیالی کی گتھیاں سلجھیں گی، یہاں تو اپنے ہی بد حال کو سدرھانے میں دماغ لگا رہے گا۔

غزل ۱۳

میرؔ صاحب زمانہ نازک ہے
دونوں ہاتھوں سے تھامئے دستار
سہل سی زندگی پہ کام کے تئیں
اپنے اُوپر نہ کیجئے دشوار
چار دن کا ہے مجہلہ یہ سب
سب سے رکھیئے سلوک ہی ناچار
واں جہاں خاک کے برابر ہے
قدر ہفت آسمانِ ظلم وشعار
یہی درخواست پاس دل کی ہے
نہیں روزہ نماز کچھ درکار

....

شعرنمبر(۱)

میرؔ صاحب زمانہ نازک ہے
دونوں ہاتھوں سے تھامئے دستار

تشریح: میرؔ اخلاقی پستی اور قدروں کی پائمالی کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ زمانہ بڑا بدل گیا ہے، بلند اخلاق لوگوں کی کمی ہوگئی، زمانے میں جس قسم کے افراد ہیں ان کو کسی کی عزت کا پاس ولحاظ نہیں رہا، کسی باعزت اہل علم واہل فن کی قدر و قیمت ان کے پاس نہیں لہٰذا میرؔ تم بھی اپنی پگڑی کی حفاظت کرنا، دونوں ہاتھوں سے تھامیئے دستار'' کا مصرعہ طنزیہ اسلوب لیے ہوئے ہے اور انسانی قدروں کی حفاظت پر اصرار کرتا ہے۔

شعرنمبر(۲)

سہل سی زندگی پہ کام کے تئیں
اپنے اُوپر نہ کیجئے دشوار

تشریح:اس شعر میں کہا گیا ہے،آسان زندگی کو اپنی قدرت سے زیادہ کاموں کو اپنے اوپر بڑھا کر مشکل مت بنائیے، یعنی اندازے کے مطابق ہی کاموں کے ذمہ داریاں لینا مناسب ہے۔

شعرنمبر(۳)

چار دن کا ہے مجہلہ یہ سب
سب سے رکھیئے سلوک ہی ناچار

مشکل الفاظ:

مجہلہ = گمنام،انجانہ پن
سلوک = رویہ،نیک برتاؤ
ناچار = مجبوراً

تشریح:شعر کا مطلب یہ ہے کہ یہ گمنام زندگی مختصر سی ہے،چار دن کی بات ہے اس میں کیا کسی قطع تعلق کرنا ہے سب سے نیک سلوک کیجئے،اگر کسی تعلق رکھنے کا جی نہیں بھی کرتا تب بھی مجبور ہو کر سہی تعلق نہ توڑیئے۔

شعرنمبر(۴)

واں جہاں خاک کے برابر ہے
قدر ہفت آسمانِ ظلم وشعار

مشکل الفاظ:

واں = وہاں
خاک کے برابر = کوئی قدر نہ ہونا

ہفت آسمان = ساتوں آسمان، مراد سارا جہان

ظلم شعار = ظلم کرنے سے جانے جانے والا

تشریح: شعر مذکورہ کا مطلب یہ ہے کہ ہم ایسے جہان میں آن پہنچے ہیں جہاں عزت وآبرو کا کوئی تصور نہیں، جہاں فنکار کی قدر خاک کے برابر بھی نہیں اس مقام پر اگر کچھ انعام ہے بھی تو وہ ظلم وستم ہی ہے ساتوں آسمان اپنے ظلم وستم سے پہچانے جاتے ہیں، یہاں تو آسمان وزمین والے دونوں ظلم کرنے پر معمور ہیں، یہاں کیا کسی کی قدر ہوگی۔

شعر نمبر(۵)

یہی درخواست پاس دل کی ہے
نہیں روزہ نماز کچھ درکار

تشریح: آخر شعر میں میؔر کہنا چاہتے ہیں کہ دل اب یہی عرض گذار ہے کہ جب اخلاقی قدروں کا کوئی لحاظ نہیں تو پھر نمازیں ادا کرنا اور روزے رکھنا کسی کام کے نہیں، کیوں کہ اعمال تو حسن اخلاق کی تکمیل کے لئے ہیں۔

غزل ۱۴

بزم میں منہ ادھر کریں کیوں کر
اور نیچی نظر کریں کیوں کر
یوں بھی مشکل ہے ووں بھی مشکل ہے
سر جھکائے گزر کریں کیوں کر
مہ فلک پر ہے وہ زمیں پر آہ
ان کو زیروزبر کریں کیوں کر
دل نہیں درد مند اپنا میرؔ
آہ و نالے اثر کریں کیوں کر

....

شعرنمبر(۱)

بزم میں منہ ادھر کریں کیوں کر
اور نیچی نظر کریں کیوں کر

تشریح: شعر مذکورہ کا مطلب ہے کہ اگر ہم محبوب کی محفل میں بیٹھیں ہیں، جلوۂ محبوب ہے، بہرور ہوئے تو اب تقاضا یہ ہے کہ جمال محبوب کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے رہیں اب نیچی نظر کرنا مقضاے حال کے مناسب نہیں۔

شعرنمبر(۲)

یوں بھی مشکل ہے ووں بھی مشکل ہے
سر جھکائے گزر کریں کیوں کر

تشریح: میرؔ کہتے ہیں جب محبوب کے بغیر تنہائی میں بیٹھے رہنا بھی تکلیف دے ہے، اور ووں بھی مشکل ہے، یعنی محبوب کی محفل میں باریابی کے بعد محبوب سے نظر ملانا بھی آسان نہیں، جب دونوں طرح مشکلیں سامنے ہیں تو پھر سر جھکا کر سر بہ جیب رہتے سے بہتر ہے کہ سر اٹھا کر محبوب کے جلوے سے ہی مستنیر ہوں۔

شعر نمبر (۳)

مہ فلک پر ہے وہ زمیں پر آہ
ان کو زیر و زبر کریں کیوں کر

مشکل الفاظ:

مہ	=	چاند، مراد محبوب ہے
فلک	=	آسماں، مراد محبوب کی بلندی، عظمت سے کنایہ یا محبوب کا دماغ آسمان پر ہونا، سے مراد تغافل محبوب ہے۔
آہ	=	فریاد
زیروزبر	=	اوپر، نیچے، نشیب وفراز، تباہ برباد

تشریح: اس شعر میں میرؔ نے عاشق ومحبوب کا مرتبہ اور دوری کا حال بیان کرنا چاہا ہے، یعنی میں کہاں، یا عاشق کہاں وہ زمین پر فریاد کر رہا ہے اور محبوب تو آسمان پر ہے میرا اور اس کا مقابلہ کیا۔ دوسرا معنی یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہم عاجزانہ طور پر اس سے فریاد کر رہے ہیں اور وہ تکبر میں مست دماغ آسمان پر دھرے ہوئے تغافل سے کام لے رہا ہے، لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ ہم اس کو راستے پر نہیں لا سکتے، ہم میں اتنی قدرت ہے کہ ہم اس کو زیروزیر کردیں، پر بہت کچھ سوچ کر سہہ لینا ہی مناسب خیال کرتے ہیں۔

شعر نمبر (۴)

دل نہیں درد مند اپنا میرؔ
آہ و نالے اثر کریں کیوں کر

آخری شعر میں میرؔ محبوب کو 'اپنا' کہہ کر تعریض کر رہے ہیں کہ جب اپنا جو محبوب ہے اس کے پاس درد رکھنے والا دل ہی نہیں پھر ہماری فریاد آہ و بکا اس پر کیا اثر کر سکتی ہے۔

غزل ۱۵

غم ہجراں میں گھبرا کر اٹھا میں
طرف گلزار کے آیا چلا میں
شگفتہ خاطری اس بن کہاں تھی
چمن میں غنچہ پیشانی رہا میں
کسو سے دل نہیں ملتا ہے یارب
ہوا تھا کس گھڑی ان سے جدا میں
تعارف ہم صفیروں سے نہیں کچھ
ہواہوں ایک مدت میں رہامیں
ہوا تھا میؔر مشکل عشق میں کام
کیا پتھرجگر تب کی دوا میں

....

شعرنمبر(۱)

غم ہجراں میں گھبرا کر اٹھا میں
طرف گلزار کے آیا چلا میں

تشریح: غزل کے مطلع میں کہا گیا ہے کہ، جب میں محبوب کی جدائی کے غم سے بے چین ہوکرگھبرا کراٹھا،تو میں پھولوں کے باغ کی طرف نکل آیا تا کہ میری گھبراہٹ دور ہو سکے۔

شعرنمبر(۲)

شگفتہ خاطری اس بن کہاں تھی
چمن میں غنچہ پیشانی رہا میں

مشکل الفاظ:

شگفتہ خاطری	=	دل کا خوش ہونا، طبیعت میں تازگی پیدا ہونا
چمن	=	پھولوں کا باغ
غنچہ پیشانی	=	سکڑی ہوئی، پیشانی، مراد غم زدہ، تنک مزاجی

تشریح: محبوب کے بنا مجھے کہاں راحت حاصل ہوسکتی ہے، میری طبیعت کو کہاں آرام مل سکتا ہے، جب انسان غم زدہ ہوتو حسین گلوں کا اثر بھی طبیعت پر نہیں ہوتا، لہٰذا میں چمن میں رہ کر بھی تنک مزاج رہا ہوں، میری تیوری چڑھی رہی ہے۔

شعرنمبر(۳)

کسو سے دل نہیں ملتا ہے یارب
ہوا تھا کس گھڑی ان سے جدا میں

تشریح: مطلب یہ ہے کہ پہلے تو محبوب سے قربت حاصل تھی، ناگہاں اُن سے جدا ہونا پڑا اب ان سے الگ ہونے کے بعد اے پروردگار کسی سے ملنے کا جی نہیں کرتا۔

شعرنمبر(۴)

تعارف ہم صفیروں سے نہیں کچھ
ہوا ہوں ایک مدت میں رہا میں

مشکل الفاظ:

تعارف	=	جان پہچان

ہم صفیر=　　　ہم آواز، ہم حال

تشریح: میرؔ اس شعر میں کہہ رہے ہیں کہ جن کا میری طرح تباہ حال ہے، جو میرے ہم آواز ہیں، ہم نوا ہیں، میں انکو جان نہ سکا، کیوں کہ میرا سودا ایسا تھا گویا کہ میں ایک لمبے زمانہ تک ہوا میں رہا ہوں، جب میرا زمین سے تعلق ہی نہیں میں اپنے آپ میں ہی نہ تھا، تو ہم نواؤں سے تعارف کیسے ہوسکتا تھا۔

شعر نمبر (۵)

ہوا تھا میرؔ مشکل عشق میں کام
کیا پتھر جگر تب کی دوا میں

مشکل الفاظ:

پتھر جگر　=　سخت کلیجہ

دوا　=　علاج

تشریح: غزل کے آخری شعر میں میرؔ عشق کی دشواریوں کا بیان کرتے ہیں کہ عشق میں کام چل پانا تب مشکل ہو گیا تھا، جب کلیجہ ستم سہہ سہہ کر پتھر ہو چکا تھا پھر دوا کیا کام کرتی۔

سبق۴

غزل ۱۶

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے
نازکی اس کے لب کی کیا کہیئے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
بار با اُس کے در پہ جاتا ہوں
حالت اب اضطراب کی سی ہے
میں جو بولا کہا کہ یہ آواز
اسی خانہ خراب کی سی ہے
میؔر ان نیم بازآنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

....

شعرنمبر(۱)

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے

مشکل الفاظ:

ہستی = زندگی،وجود،دنیا

حباب = بلبلہ

سراب = ریگستان میں پانی کی طرح نظر آنے والا منظر

مراد = فریب دھوکا

تشریح: غزل کے مطلع میں زندگی اور دنیا کی ناپائداری سمجھاتے ہوئے میرؔ ہستی کو حباب اور دنیا کی نمائش کو سراب سے تشبیہ دیتے ہیں۔ انسان کی زندگی ایک پانی کے بلبلے کی مانند ہے کہ ابھی اٹھا اور ابھی ٹوٹ کر بکھر گیا، اسی طرح ہستی بھی ناپائیدار ہے، یہ دنیا کی آرائش سراب کی طرح ایک فریب ہے۔

شعر نمبر (۲)

نازکی اس کے لب کی کیا کہیئے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

تشریح: میرؔ محبوب کے ہونٹوں کی نزاکت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ محبوب کے ہونٹ کی نازکی ایسی ہے جیسے گلاب کی پتی میں نازک پن ہوتا ہے، گلاب کی پتی پر اگر ہاتھ لگے تو دھبا پڑھنے کا اندیشہ ہوتا ہے اسی طرح محبوب کے نازک ہونٹ بھی ہیں کہ لب سے لب لگ جائے تو داغ پڑ سکتا ہے۔

شعر نمبر (۳)

بار با اُس کے در پہ جاتا ہوں
حالت اب اضطراب کی سی ہے

تشریح: محبوب کے دروازے پر بار بار حاضر ہوتا ہوں کہ میرے بے چین دل کی گھبراہٹ دور ہو جائے۔

شعر نمبر (۴)

میں جو بولا کہا کہ یہ آواز
اسی خانہ خراب کی سی ہے

تشریح: جب میں محبوب کے در پر پہنچا تو میں نے دستک دی، محبوب نے دریافت کیا کہ کون جب میں نے جواب دیا تو

محبوب نے میری حالت جان لی اور کہا یہ تو وہی اجڑا ہوا خرابہ خانہ ہے جو ہمارے عشق میں اجڑ چکا ہے۔

شعر نمبر (۵)

میؔر ان نیم بازآنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

مشکل الفاظ:

نیم بار = آدھی کھلی ہوئی
مستی = نشیلی

تشریح: میؔر کہتے ہیں کہ میری نظر محبوب پر پڑی جب وہ سو رہا تھا تو اس کی آدھی کھلی ہوئی آنکھیں ایسی نشیلی تھیں کہ وہ مستی شراب کی سی مستی لگتی ہے۔

غزل ۱۷

ہو کوئی بادشاہ کوئی یاں وزیر ہو
اپنی بلا سے بیٹھ رہے جب فقیر ہو
کس طرح آہ خاک مذلت سے میں اٹھوں
افتاد تر جو مجھ سے مرا دستگیر ہو
حد سے زیادہ جوروستم خوشنما نہیں
ایسا سلوک کر کہ تدارک پذیر ہو
دم بھر نہ ٹھہرے دل میں نہ آنکھوں میں ایک
پل
اتنے سے قد پہ تم بھی قیامت شریر ہو
ایک وقت خاص حق میں مرے کچھ دعا کرو
تم بھی تو میرؔ صاحب قبلہ فقیر ہو

....

سوال نمبر(۱)

ہو کوئی بادشاہ کوئی یاں وزیر ہو
اپنی بلا سے بیٹھ رہے جب فقیر ہو

تشریح: غزل کے مطلع میں میرؔ کہتے ہیں کہ ہم فقیر ہیں، ہم تو اپنے محبوب کی یاد میں غرق ہیں، ہماری بلا سے کوئی بادشاہ ہو یا کوئی وزیر ہو ہم کیوں کسی کے احترام لیے اٹھ کھڑے ہوں۔

سوال نمبر(۲)

کس طرح آہ خاک مذلت سے میں اٹھوں
افتاد تر جو مجھ سے مرا دستگیر ہو

مشکل الفاظ:

خاک مذلّت = ذلّت کی خاک، رسوائی
افتادہ تر = زیادہ ذلت میں گرا ہوا

تشریح: اس شعر میں میؔر نے کہا کہ افسوس ہے کہ جو میرے حامی میری راہ میں آئے وہ مجھ سے کمزور تھے، میں تو ذلت کی خاک میں گرد آلود تھا ہی لیکن جو میرے مددگار تھے وہ مجھ سے بھی زیادہ گرے ہوئے تھے آخر وہ کیسے مجھے رسوائی سے نکال سکتے تھے۔

سوال نمبر(۳)

حد سے زیادہ جوروستم خوشنما نہیں
ایسا سلوک کر کہ تدارک پذیر ہو

مشکل الفاظ:

جوروستم = ظلم وزیادتی
خوشنما = اچھا لگنا
سلوک = رویہ، طریقہ
تدارک = چارہ کرنا، حل نکالنا

تشریح: میؔر اپنے محبوب سے مخاطب ہیں کہ ٹھیک ہے تم ہم پر ظلم کرتے ہوئے ستم ڈھاتے ہو، ہمیں منظور ہے لیکن حد سے زیادہ مصائب نہ ڈھاؤ کہ جنہیں برداشت کرنے کی سکت نہ ہو اور وہ اچھے نہ لگیں، بلکہ ایسا سلوک کیا کرو کہ جس کا چارہ کیا جا سکے۔

سوال نمبر(۴)

دم بھر نہ ٹھہرے دل میں نہ آنکھوں میں ایک
پل
اتنے سے قد پہ تم بھی قیامت شریر ہو

تشریح: اس شعر میں میؔر نے نازک خالی پیدا کی ہے، محبوب سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔ تیرا قد بھی کوئی قد ہے کہ ایک پل نہ تو دل میں ٹھہر سکے اور نہ ہی ایک لمحہ آنکھوں میں تصور کیا جا سکتا ہے پھر بھی اتنے سے قد پہ تم قیامت برپا کر دیتے ہو۔

سوال نمبر(۵)

ایک وقت خاص حق میں مرے کچھ دعا کرو
تم بھی تو میؔر صاحب قبلہ فقیر ہو

تشریح: اس شعر میں میؔر خود کو اللہ کا نیک بندہ کہہ کر مخاطب کرتے ہیں کہ اے میؔر آپ بھی تو فقیروں کے آقا ہو تو کیوں نہیں میرے حق میں خاص دعا کرتے کہ ان سبھی ظلم وستم سے ہم چھٹکارا پا جائیں۔

غزل ۱۸

مطرب نے پڑھی تھی غزل اک میؔر کی شب
مجلس میں بہت وجد کی حالت رہی سب کو
برسوں تئیں جب ہم نے تردّد کیے ہیں تب
پہنچایا ہے آدم تئیں واعظ کے نسب کو
حیرت ہے کہ ہے مدعی معرفت اک خلق
کچھ ہم نے تو پایا نہیں اب تک ترے ڈھب کو
ہوگا کسو دیوار کے سائے میں پڑا میؔر
کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

....

شعر نمبر(۱)

مطرب نے پڑھی تھی غزل اک میؔر کی شب
مجلس میں بہت وجد کی حالت رہی سب کو

مشکل الفاظ:

مطرب = مغنّی، گویا
وجد = مستی اور سرور کے ساتھ حال میں آنا

تشریح: میؔر تعلّی سے کام لیتے ہوئے اپنی غزل کی معنویت اور کیفیت کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں میرا کلام کوئی لفظی گورکھ دھندا نہیں بلکہ جو پڑھتا ہے سر دھنتا ہے مستی و سرور میں آجاتا ہے کل رات کی بات ہے کہ گویّا نے میؔر کی غزل

کیا پڑھی مجلس میں سب پر ووجد کی کیفیت طاری رہی۔

سوال نمبر(۲)

برسوں تئیں جب ہم نے تردُّد کیے ہیں تب
پہنچایا ہے آدم تئیں واعظ کے نسب کو

مشکل الفاظ:

تردُّد	=	غور وفکر، مطالعہ کی گہرائی
آدم	=	دنیا کے پہلے انسان اور اللہ کے پہلے پیغمبر
نسب	=	خاندانی شجرہ، خاندانی تسلسل وربط

تشریح: شعر مذکورہ میں کہا گیا کہ نصیحت و وعظ یہ ہر کس و ناکس کا کام نہیں یہ بڑا مقدس فریض ہے جب ہم نے گہرائی سے تسلسل کے ساتھ مطالعہ کیا، غور وفکر کیا تب ہم پر یہ راز منکشف ہوا کہ یہ واعظ کا خاندانی نسب تو اللہ کے پہلے پیغمبر اور انسان سے جا ملتا ہے گویا وعظ کرنا انسان کی قدر ہے۔ انسان کی عظمت ہے۔

سوال نمبر(۳)

حیرت ہے کہ ہے مدعی معرفت اک خلق
کچھ ہم نے تو پایا نہیں اب تک ترے ڈھب کو

مشکل الفاظ:

حیرت	=	حیران ہونا
مدعی	=	دعویٰ کرنے والا
معرفت	=	پہچان
خلق	=	مخلوق
ڈھب	=	طریقہ

تشریح: اس شعر میں میؔر ایک اہم بات کررہے ہیں جو محبوب حقیقی کی معرفت سے متعلق ہے، اے خدا تیری بہت ساری مخلوق ہے جو اس بات کا دعویٰ کرتی ہے کہ ہم نے اللہ کی معرفت کو حاصل کرلیا ہے لیکن میں ان کے اس کہنے سے بہت حیران ہوں کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے، لمبی مدت گذر چکی ہے کہ میں اس کی معرفت کی تلاشی ہوں ابھی تک کوئی طریقہ تک معلوم نہیں ہوا کہ اس کے پہچان کا کیا طرز ہے کیا ڈھب ہے، تو لوگ کیسے اس کی معرفت تک پہنچ گئے۔

سوال نمبر(۴)

ہوگا کسو دیوار کے سائے میں پڑا میؔر
کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

مشکل الفاظ:

کسو	=	کسی
آرام طلب	=	راحت پسند

تشریح: میؔر کہتے ہیں کہ محبت اور عشق کی راہیں بڑی کھٹن ہوتی ہیں، یہاں گھر گرہستی تو کیا، سب کچھ ترک کرنا پڑتا ہے، نہ لباس کا خیال ہوتا ہے نہ کھانے پینے کا، نہ دھوپ کا احساس ہوتا ہے نہ چھاؤں کی طلب، بلکہ یہاں تو عاشق ہر حال میں محبوب کی رضا اور اس کے جلوے کا پیاسا ہوتا ہے، لیکن میؔر محبت وعشق کے دعوے کررہا ہے یہ بھی کوئی محبت ہے، کہ گھر تو اس نے چھوڑا ہے لیکن دیوار کے سائے میں بیٹھ کر آرام کا خواہش مند ہے۔ یہ محبت وعشق کی کلفتوں کے منافی ہے اس حال میں اس کو کیا تعلق ہے محبت سے۔

غزل ۱۹

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم
اب جو ہیں خاک انتہا ہے یہ
بودِ آدم نمود شبنم ہے
ایک دو دم میں پھر ہَوا ہے یہ
شکراس کی جفا کا ہو نہ سکا
دل سے اپنے ہمیں گلا ہے یہ
شور سے اپنے حشر ہے پر وہ
یوں نہیں جانتا کہ کیا ہے یہ
دیکھ بے دم مجھے لگا کہنے
ہے تو مردہ سا پر بلا ہے یہ
میؔر کو کیوں نہ مغتنم جانیں
اگلے لوگوں میں بھی رہا ہے یہ

....

شعرنمبر(۱)

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم
اب جو ہیں خاک انتہا ہے یہ

مشکل الفاظ:

آگے/آگ= آگے معنی پہلے کے ہیں، یعنی عشق کرنے سے پہلے کا حال اور اگر متن ''گے'' اضافی نہیں آگے

کے معنی میں تو پھر آگ ہوسکتا ہے، جس سے مراد جوانی، شباب، تندرست وتوانا، ہوش وحواس کا سلامت رہنا ہے۔ ''میں نے'' آ گئے'' یہاں لکھا ہے کیوں کہ ''انتخابِ کلام میرؔ'' میں یہی مرقوم ہے۔

تشریح: اس شعر کا ایک مطلب یہ ہے کہ عشق ومحبت ہونے سے پہلے ہم، باہوش، باہمت رسیلے، بہادر، صاحبِ حیثیت ،سب کچھ تھے لیکن عشق کے رازوں کو سمجھ لینے کے بعد یعنی آخر عشق میں ہم بالکل سب کچھ ختم ہو جانے کے بعد مٹی ہی رہ گئے ہیں۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگر'' آ گئے'' کو'' آگ'' مانا جائے تو یعنی عشق کی ابتداء میں ہم آگ تھے، متحرک تھے، ہر مشکل سے مشکل مہم سر کر سکتے تھے، لیکن اب انتہائے عشق پر ہمارا حال اتنا ضعیف ہے کہ ہماری اہمیت ،صرف مٹی رہ گئی اب ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے ہیں ہمارا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔

شعر نمبر (۲)

بودِ آدم نمود شبنم ہے
ایک دو دم میں پھر ہَوا ہے یہ

مشکل الفاظ:

بودِ آدم = آدمی کی ہستی/ زندگی، رہائش آدم
نمودِ شبنم = اوس کا نشان
ایک دو دم = ایک دو سانس

تشریح: اس شعر میں میرؔ انسانی زندگی اور ہستی کو نہایت اچھوتے اسلوب اور لفظیات میں ناپائیدار جتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ آدمی کی زندگی یا ہستی صرف شبنم کا نشان ہے جو ایک دو لمحہ میں ہَوا ہو جاتا ہے یہ، آدمی شبنم کی طرح ناپائیدار ہے، اس کی کوئی ہستی نہیں۔

شعر نمبر (۳)

شکر اس کی جفا کا ہو نہ سکا
دل سے اپنے ہمیں گلا ہے یہ

مشکل الفاظ:

شکر = شکریہ
جفا = ستم،ظلم، بےوفائی
گلا = شکوہ

تشریح: شعر مذکور میں میرؔ طنزیہ اور تعریضیہ اسلوب میں کہہ رہے ہیں کہ محبوب نے جو ظلم اور ستم ہم پر ڈھائے ہیں، اتنے غم و درد کی سوغاتیں پیش کی ہیں، اس کے بدلے میں ہمیں محبوب کا شکریہ ادا کرنا چاہئے تھا لیکن ہمیں اپنے دل پہ یہ شکوہ ہے کہ اس میں اتنی سکت نہ بچی کہ وہ اس پر ان کا شکریہ ادا کر سکے، اتنے ہی ستم سے یہ ہار گیا جو شکریہ بھی نہ ادا کر سکا۔ اس شعر میں میرؔ نے درد کی شدت کا احساس تعریضیہ پیرائے میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

شعر نمبر(۴)

شور سے اپنے حشر ہے پر وہ
یوں نہیں جانتا کہ کیا ہے یہ

مشکل الفاظ:

شور = ہنگامہ،غوغہ، مراد آہ و بکا کی دردناک آواز اس لفظ کو میرؔ نے، آہ و بکا کے معنی کثرت سے برتا ہے۔
حشر = قیامت

تشریح: اس شعر میں میرؔ محبوب کی جانب سے تجاہل عارفانہ کے اسلوب میں تغافل کی کیفیت اور حال کی ترجمانی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ محبوب کی محبت میں ہم ظلم و ستم اتنے سہے ہیں کہ میری آہ وگریہ سے اس قدر شور برپا ہے کہ قیامت کا سماں چھایا ہے ہر کوئی اس حشر سے بے چین ہے لیکن محبوب کے تغافل کا عالم یہ ہے کہ جانتے ہوئے بھی انجان بن کر کہتا ہے کہ یہ کیا ہے؟

شعر نمبر (۵)

دیکھ بے دم مجھے لگا کہنے
ہے تو مردہ سا پر بلا ہے یہ

تشریح: محبوب نے میری طرف کوئی توجہ نہیں کی جب میں ہوش وحواس، قوت وشباب میں تھا، لیکن جب میں اسکی محبت میں سب کچھ کھو بیٹھا، نہ مال ودولت، نہ شباب ورنگینی، نہ عزت وقدر، نہ طاقت وہمت، بے سانس اور نیم جاں اب پڑا ہوں، ہر رنگ پر ضعف چھا گیا ہے، ایسے حال میں محبوب نے توجہ کی اور کہنے لگا ہے تو یہ نیم جاں مردہ سا ہے، لیکن عشق کی چنگاری اب بھی بلا کی سی ہے

شعر نمبر (۵)

مِیر کو کیوں نہ مغتنم جانیں
اگلے لوگوں میں بھی رہا ہے یہ

مشکل الفاظ:

مغتنم = غنیمت، قابل قدر

اگلے لوگ = مراد: اہل علم وفن، صاحب احترام

تشریح: اس آخری شعر میں مِیر انکساری اور عاجزی کے پیرائے میں اپنی قدر کا احساس دلاتے ہیں۔ کہ اور تو کوئی خوبی مِیر میں نہیں ہے کوئی اس کی قدر و قیمت نہیں ہاں ایک طرح سے یہ ہمارے لئے غنیمت ہے قابل احترام ہے کیوں کہ مِیر صاحب عزت واحترام اور بلند مرتبہ بزرگوں میں رہا ہے، اس کی ذاتی لیاقت کی وجہ سے نہ ہی اس کے طفیلی مراتب کے سبب کی ہی اس کی قدر کرلو۔

غزل ۲۰

ہم سے آگے بھی زمانے میں ہوا کیا کیا کچھ
تو بھی ہم غافلوں نے آ کے کیا کیا کیا کچھ
کیا کہوں تجھ سے کہ کیا دیکھا ہے تجھ میں
میں نے
عشوہ وغمزہ وانداز و ادا کیا کیا کچھ
دل گیا، ہوش گیا ، صبر گیا ، جی بھی گیا
شغل میں غم کے ترے ہم سے گیا کیا کیا کچھ
نام ہیں خستہ وآوارہ و بدنام مرے
ایک عالم نے غرض مجھ کو کہا کیا کیا کچھ
حسرت وصل وغم ہجر وخیال رخِ دوست
مر گیا میں پہ مرے جی میں رہا کیا کیا کچھ
دردِ دل زخم جگر کلفتِ غم داغِ فراق
آہ عالم سے مرے ساتھ چلا کیا کیا کچھ
ایک محروم چلے میرؔ ہمیں عالم سے
ورنہ عالم کو زمانے نے دیا کیا کیا کچھ

....

شعر نمبر(۱)

ہم سے آگے بھی زمانے میں ہوا کیا کیا کچھ
تو بھی ہم غافلوں نے آ کے کیا کیا کیا کچھ

تشریح: غزل کے مطلع میں میرؔ کہہ رہے ہیں کہ ہمارے دنیا میں آنے سے پہلے بہت سے لوگ دنیا میں آئے، ان کی بھی سخت سے سخت آزمائش ہوئیں، ان پر بھی ظلم وستم ہوئے ان کی بھی بربادیاں مشہور ہوئیں نہ جانے کیا کیا ان پر بیتا، کیا کیا کارنامے انہوں نے انجام دیئے یہ سب کچھ جاننے کے باوجود ہم بے خبر ہی رہے ہم نے اپنی غلطیوں کا تدارک نہیں کیا اور ہم سنبھل نہیں پائے۔

شعر نمبر(۲)

کیا کہوں تجھ سے کہ کیا دیکھا ہے تجھ میں
میں نے
عشوہ وغمزہ وانداز و ادا کیا کیا کچھ

مشکل الفاظ:

عشوہ = پوشیدہ حرکت، نازو انداز
غمزہ = اشارۂ ابر

تشریح: اے محبوب میں کیا بتاؤں کہ میں نے تجھ میں کیا کیا دیکھا ہے اس میں تیری تعریف کروں یا تیرے تغافل کے گُر پیش کروں، تجھ میں نازو انداز ہیں اشارہ ابر پینترے بدل بدل وار کرنا ہے، دلکش ادائیں اور عشوہ طرازیاں ہیں۔

شعر نمبر(۳)

دل گیا، ہوش گیا، صبر گیا، جی بھی گیا
شغل میں غم کے ترے ہم سے گیا کیا کیا کچھ

مشکل الفاظ:

جی جانا = جان جانا
شغل = کام

تشریح: اے محبوب تیری محبت کے غم کے شغل میں ہم ایسے پھنسے، ہمارا سارا سامان لٹ گیا، کیا کیا ہم شمار کریں دل بھی گیا، ہوش وحواس اڑے، برداشت کا مادہ گیا، یہاں تک کہ جان بھی گئی، تیری محبت کے شغل میں گم ہو کر ہم نے سب کچھ کھو دیا۔

شعر نمبر (۴)

نام ہیں خستہ وآوارہ و بدنام مرے
ایک عالم نے غرض مجھ کو کہا کیا کیا کچھ

مشکل الفاظ:

خستہ نام = ماندہ، پھیکا پڑا ہوا
آوارانام = اوباش، رسوا
عالم = جہان، دنیا، لوگ

تشریح: میؔر کہتے ہیں کہ میری حالت اتنی تباہ حال تھی کہ جس کو جو نام بن پڑا، اس نے وہی کچھ کہا، کس کس طرح سے میرا اعتبار خراب نہیں کیا گیا، کسی نے خستہ کہا کسی آوارہ واوباش کہا کسی نے ماندہ اور کسی نے رسوائے زمانہ۔

شعر نمبر (۵)

حسرت وصل وغم ہجر وخیال رخِ دوست
مرگیا میں پہ مرے جی میں رہا کیا کیا کچھ

مشکل الفاظ:

حسرت وصل = وصال کی آرزو

غم ہجر = جدائی کا غم

خیال رخِ دوست = محبوب کے چہرے کا تصور

تشریح: تمام عمر میں محرومی اور حرماں نصیبی کا شکار رہا میری کوئی آرزو پوری نہیں ہوئی، وصال کی آرزو حسرت ہی رہی، جدائی کے غم میں گھلتا رہا، نہ کبھی محبوب کا جلوہ نظر آیا محبوب کا چہر تصور ہی رہا، افسوس، ہائے افسوس آہ میں مر گیا یہ تمام غم اپنے دل میں ہی لے مرا، جواب بھی ستا رہے ہیں۔

شعر نمبر(٦)

دردِ دل زخم جگر کلفتِ غم داغِ فراق
آہ عالم سے مرے ساتھ چلا کیا کیا کچھ

مشکل الفاظ:

دردِ دل = دل کا درد

زخم جگر = کلیجہ کا گھاؤ

کلفتِ غم = غم کی تکلیف

داغِ فراق = جدائی کے درد کا دھبا

تشریح: اس جہان میں ہم آئے لیکن ہمیں کوئی راحت نہیں ملی یہ درد و غم صرف زندگی میں ہی ہمارے ساتھ نہیں رہے بلکہ ہماری قبر میں بھی یہ سارے درد ہمارے ساتھ ہی چلے آئے ہیں، آہ وہ کیا کیا ہیں دردِ دل، زخم جگر، کلفتِ غم داغِ فراق، کچھ بھی دنیا میں نہیں رہا سب کا ساتھ میرے ہی نصیبہ میں ہے۔

شعرنمبر(۷)

ایک محروم چلے میؔر ہمیں عالم سے
ورنہ عالم کو زمانے نے دیا کیا کیا کچھ

مشکل الفاظ:

محروم = نامراد،حرماں نصیب

عالم = جہان،دنیا،لوگ

تشریح: میؔر غزل کے آخری شعر میں کہہ رہے ہیں زمانے کا دستور ہماری سمجھ میں نہیں آیا،ایک طرف زمانے نے جہان کو سب نعمت عطا کیں ہیں،ہم ہی ایسے حرماں نصیب ہیں جس کو کچھ بھی حاصل نہ ہوا اور نامراد ہوکر اس جہان سے واپس چلے ہیں۔

سبق ۵

غزل ۲۱

برقے کو اٹھا چہرے سے وہ بت اگر آوے
اللہ کی قدرت کا تماشا نظر آوے
اے ناقہ لیلیٰ دو قدم راہ غلط کر
مجنونِ ز خودرفتہ کبھی راہ پر آوے
ممکن نہیں آرام دے بے تابی جگر کی
جب تک نہ پلک پر کوئی ٹکڑا نظر آوے
کہتے ہیں تیرے کوچے سے میرؔ آنے کہے ہے
جب جانے وہ خانہ خراب اپنے گھر آوے

....

شعر نمبر (۱)

برقے کو اٹھا چہرے سے وہ بت اگر آوے
اللہ کی قدرت کا تماشا نظر آوے

مشکل الفاظ:

برقے	=	حجاب
بت	=	محبوب
قدرت کا تماشا نظر آنا	=	قدرت کا کھیل، قدرت کا شاہکار

تشریح: محبوب سے مخاطب ہو کر میرؔ نے کہا ہے کہ اے محبوب اپنے چہرے سے حجاب ذرا ہٹاؤ تا کہ اس بت کا جلوہ نظر

آئے جو اللہ کی قدرت کا شاہکار ہے۔

شعرنمبر(۲)

اے ناقہ لیلیٰ دو قدم راہ غلط کر
مجنونِ ز خودرفتہ کبھی راہ پر آوے

مشکل الفاظ:

ناقہ لیلیٰ = لیلیٰ کی اونٹنی

خودرفتہ = آپے سے باہر ہونا، بے ہوشی کا شکار ہونا

تشریح: اس شعر میں تلمیحی پیرائے میں میرؔ ایک نادر معنی پیدا کر رہے ہیں کہ لیلیٰ مجنوں پر مہربان ہے پر مجنوں آپے سے باہر ہے اس لئے لیلیٰ کو اپنی روش میں تبدیلی لانی چاہئے کہ اپنی سیدھی راہ یعنی وفا کی راہ سے ذرا بھٹکنا چاہئے، تاکہ مجنون اس تغافل سے اپنے ہوش میں آئے، اپنی وارفتگی سے لیلیٰ کی جانب متوجہ ہو۔

شعرنمبر(۳)

ممکن نہیں آرام دے بے تابی جگر کی
جب تک نہ پلک پر کوئی ٹکڑا نظر آوے

مشکل الفاظ:

بے تابی جگر کی = بے چینی کلیجہ کی

پلک پر ٹکڑا نظر آنا = آنسو

تشریح: جگر کی بے چینی دور ہونا ممکن نہیں، دل کا غبار جب تک آنسو کے ٹکڑے بن آنکھ سے باہر میں نظر باہر نہ آجائے تب تک دل کو راحت حاصل نہیں ہوسکتی۔

شعرنمبر(۴)

کہتے ہیں تیرے کوچے سے میرؔ آنے کہے
ہے
جب جانے وہ خانہ خراب اپنے گھر آوے

تشریح: غزل کے آخری شعر میں میرؔ کہتے ہیں، لوگوں کا کہنا ہے کہ میرؔ تب تک محبوب کی گلی سے آنے والا نہیں، ہاں اگر محبوب اس بدحال، خانہ خراب کے گھر آئے تو پھر میرؔ بھی اس کی گلی کو چھوڑ کر گھر آ سکتا ہے۔

غزل ۲۲

غالب کہ یہ دل خستہ شب ہجر میں مر جائے
یہ رات نہیں وہ جو کہانی میں گزر جائے
نے بت کدہ ہے منزلِ مقصود نہ کعبہ
جو کوئی تلاشی ہو ترا آہ کدھر جائے
یاقوت کوئی ان کو کہے ہے کوئی گل برگ
ٹک ہونٹ ہلا تو بھی کہ اک بات ٹھہر جائے
اس ورطے سے تختہ جو کوئی پہونچے کنارے
تو میؔر وطن میرے بھی شاید یہ خبر جائے

....

شعر نمبر(۱)

غالب کہ یہ دل خستہ شب ہجر میں مر جائے
یہ رات نہیں وہ جو کہانی میں گزر جائے

مشکل الفاظ:

غالب = ظن، یقین کے قریب
دل خستہ = چور چور دل، شکستہ دل
شب ہجر = جدائی کی رات

تشریح: مجھے یقینی طور پر ایسا لگتا ہے کہ جدائی کی رات کے درد سے اس خستہ دل کا یہ حال ہے کہ کہیں جان نہ دے دوں،

یہ رات نہایت ہی تکلیف دے اور جان لیوا ہے، کیوں کہ یہ وہ رات نہیں جس میں کہانی کہی جائے اور کہانی کی لطافت سے رات گذر جائے۔

شعر نمبر (۲)

نے بت کدہ ہے منزلِ مقصود نہ کعبہ
جو کوئی تلاشی ہو ترا آہ کدھر جائے

مشکل الفاظ:

منزل مقصود	=	ہدف
بت کدہ	=	معبد، علامت ہندو دھرم سے
کعبہ	=	مسلمانوں کا قبلہ، علامت
تلاشی	=	جستجو کرنے والا

تشریح: اے محبوب ہم نے تجھے بت کدے میں ڈھونڈا اور کعبہ میں بھی دیکھ لیا، تجھے ہم کہیں نہ پا سکے، ہم منزل مقصود کو حاصل نہیں کر پائے۔ اب تو ہی بتا، جو صرف اور صرف تیری ہی تلاش میں ہو تو، تو اُسے کہاں مل سکتا ہے، اس لئے کہ وہ تیرے جلوے کے دیکھے بنا جی نہیں سکتا۔

شعر نمبر (۳)

یاقوت کوئی ان کو کہے ہے کوئی گل برگ
ٹک ہونٹ ہلا تو بھی کہ اک بات ٹھہر جائے

مشکل الفاظ:

یاقوت	=	قیمتی لال، موتی
گل برگ	=	پھول کی پتی

تشریح: محبوب کے حسن و جمال کا کیا کہنا، کوئی اسے سرخ یاقوت کہتا ہے، تو کوئی اسے پھول کی پتی، لیکن ان دونوں چیز

وں میں تیرے ہونٹوں کی خصوصیت نہیں، جب ہم یہ کہنا چاہتے ہیں تو اسی وقت تیرے ہونٹوں پر ہلکی سی حرکت ہوتی ہے تو ایک اور جمال نظر آتا ہے تو وہ بات وہیں دہن میں ہی اٹک جاتی ہے۔

شعر نمبر (۴)

اس ورطے سے تختہ جو کوئی پہونچے کنارے
تو میرؔ وطن میرے بھی شاید یہ خبر جائے

مشکل الفاظ:

ورطہ = بھنور، ہلاکت کی جگہ
تختہ = تابوت، لکڑی کا کوئی تختہ

تشریح: میرؔ کہتے ہیں کہ جیتے جی تو ہمارے، ہماری کوئی خبر وطن نہیں پہنچی ہاں! اس بحر حیات میں بھنور پیدا ہو کہ ہلاکت کا سامان تیار ہو تو کسی طرح ہمارا تابوت کنارے لگے، اس طرح ہمارے وطن میں ہماری بھی خبر مشہور ہو۔

غزل ۲۳

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے
وہ کیا چیز ہے آہ جس کے لئے
ہر ایک چیز سے دل اٹھا کر چلے
کوئی نا امیدانہ کرتے نگاہ
سو تم ہم سے منہ بھی چھپا کر چلے
دکھائی دیئے یوں کہ بے خود کیا
ہمیں آپ سے بھی جدا کر چلے
جبیں سجدے کرتے ہی کرتے گئی
حق بندگی ہم ادا کر چلے
پرستش کی یاں تک کہ اے بت تجھے
نظر میں سبھوں کی خدا کر چلے
گئی عمر در بند فکر غزل
سو اس فن کو ایسا بڑا کر چلے
کہیں کیا جو پوچھے کوئی ہم سے میر
جہاں میں تم آئے تھے کیا کر چلے

شعر نمبر(۱)

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

مشکل الفاظ:

فقیرانہ = مفلسانہ

صدا = آواز، آہ وبُکا

تشریح: غزل کے مطلع میں میرؔ کہہ رہ ہیں کہہ ہماری زندگی فقیرانہ ہے، ہم درویش ہیں نہ ہمارا کوئی گھر ہے نہ ہمارے پاس مال ودولت ہے، ہم یہاں دنیا میں قلندرانہ مزاج لے کر آئے ہیں، فقیروں کی طرح صدائیں لگا چکے ہیں، اے میرے احباب، اے خدا کی مخلوق آپ لوگ خوش رہو، ہم نے آپ کیلئے دُعا کردی ہے۔

شعر نمبر(۲)

وہ کیا چیز ہے آہ جس کے لئے
ہر ایک چیز سے دل اٹھا کر چلے

تشریح: ہم نے جہان میں آکر چین نہیں پایا، بس ایک ایسی شئے ہے جس کے لئے تمام عمر آہیں نکلتی رہی ہیں، آخر ہر چیز سے دل اُٹھ گیا ہے اور نامراد ہو کر واپس جا رہے ہیں۔

شعر نمبر(۳)

کوئی نا امیدانہ کرتے نگاہ
سو تم ہم سے منہ بھی چھپا کر چلے

تشریح: اس شعر میں میرؔ نے نا اُمیدی کی انتہا کردی ہے، محبوب سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں، ہم نے سوچا کہ کبھی ہماری امید، تو بھر نہیں آئی، اب کی بار ہمیں خیال آیا ہے کہ محبوب کے آمنے سامنے ہوئے تو نااُمیدانہ ہی امید کریں گے، لیکن ہماری محرومی پر بھی افسوس ہے کہ تم گذرے بھی تو منہ چھپا کر نکل گئے، ہماری ناامیدانہ نگاہ بھی محرومی کا شکار ہوگئی۔

شعر نمبر(۴)

دکھائی دیئے یوں کہ بے خود کیا
ہمیں آپ سے بھی جدا کر چکے

مشکل الفاظ:

بےخود = بے ہوش، مست

جدا = الگ

تشریح: اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ محبوب کا جلوہ ایسا نظر آیا کہ ہم بے ہوش ہو گئے ہم پر بے خودی اور مستی کا ایسا عالم چھا گیا کہ محبوب سے تو فراق تھا ہی، ہم خود سے بھی بیگانہ ہو گئے ہیں، ہم خود سے الگ ہو چکے ہیں۔

شعر نمبر(۵)

جبیں سجدے کرتے ہی کرتے گئی
حق بندگی ہم ادا کر چلے

مشکل الفاظ:

جبیں = پیشانی، ماتھا

سجدہ = پیشانی کو بندگی کی نیت سے زمین پر رکھنا

تشریح: ہم نے محبوب کی بندگی اس سخت جانی سے کی ہے کہ ہم نے بندگی کا حق ادا کر دیا، کیوں کہ سجدے پر سجدے کرنے ہی سے ہماری پیشانی گھس گئی۔

شعر نمبر(٦)

پرستش کی یاں تک کہ اے بت تجھے
نظر میں سبھوں کی خدا کر چلے

مشکل الفاظ:

پرستش = پوجا، عبادت

بت = مراد، محبوب

تشریح: اے محبوب ہم نے تیری پوجا اس طرح کی یعنی ہر وقت تیری یاد میں آسن مارے بیٹھے رہے کہ ہم سبھی لوگوں کی

نظروں میں تجھے ہی خدا بنا کر چل بسے۔

شعر نمبر(۷)

گئی عمر در بند فکر غزل
سو اس فن کو ایسا بڑا کر چلے

مشکل الفاظ:

عمر = زندگی
در بند فکر غزل = غزل کی درستگی کی فکر، فن کا درجہ

تشریح: اس شعر میں میؔر تعلّی سے کام لیتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ تعلّی ان کی بجا بھی ہے۔ غزل کے فن کو جس مرتبہ پر میؔر نے پہنچایا، اُس سے آگے فن غزل کو کوئی نہ لے جا سکا، وہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنی تمام عمر غزل کی درستگی کی فکر میں گذار دی، آخر کار غزل کے فن کو عظمتوں پر پہنچا کے جا رہے ہیں۔

شعر نمبر(۸)

کہیں کیا جو پوچھے کوئی ہم سے میر
جہاں میں تم آئے تھے کیا کر چلے

تشریح: غزل کے آخری شعر میں میؔر انکساری اور عاجزی سے کام لیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم سے تو کوئی اچھا اور بڑا کام انجام نہیں پایا جو قابل ذکر ہو، اگر کوئی ہم سے پوچھ لے کہ تمام عمر تم نے کیا کیا، کونسا اہم کارنامہ انجام دیا ہے، ہم کیا کہیں ہم سے تو کوئی ایسا کارنامہ سرانجام نہیں پایا جس کو ہم ذکر کر سکیں۔

غزل ۲۴

تم نہیں فتنہ ساز سچ صاحب
شہر پر شور اس غلام سے ہے
کوئی تجھ سا بھی کاش تجھ کو ملے
مدعا ہم کو انتقام سے ہے
شعر میرے ہیں سب خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے
سہل ہے میؔر کا سمجھنا کیا
ہر سخن اس کا اک مقام سے ہے

....

شعرنمبر(۱)

تم نہیں فتنہ ساز سچ صاحب
شہر پر شور اس غلام سے ہے

مشکل الفاظ:

فتنہ ساز = فساد کرنے والا

شور = شورش، فریاد، آہ

تشریح: اے محبوب تم سے تو دنیا میں کوئی فساد پیدا نہیں ہوا، یہ سچ ہے کہ اس کے گنہگار تو ہم ہی ہیں، یہی غلام ہے جس کے سبب شہر بھر میں شورش پھیلی ہوئی ہے۔

شعر نمبر (۲)

کوئی تجھ سا بھی کاش تجھ کو ملے
مدعا ہم کو انتقام سے ہے

مشکل الفاظ:

مدعا = مقصد

انتقام = بدلہ

تشریح: ہائے، افسوس ہے کہ ہم تم سے بدلہ نہیں لے سکتے ہم تو بے چارے ٹھہرے مجبور، شرافت کی ڈور میں بندھے ہوئے، کاش کہ یہاں کوئی تم سا ہوشیار ہوتا جو انتقام لے سکتا، ہمیں تو مطلب انتقام سے ہے خواہ کوئی بھی لے۔

شعر نمبر (۳)

شعر میرے ہیں سب خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

مشکل الفاظ:

خواص = اہل علم، اہل فن، رازدارِ فن

تشریح: اس شعر میں میرؔ اپنے شعر کی خوبی کی طرف اشارہ کر رہے ہیں، یہ درست ہے کہ میرے اشعار کو اہل علم اور اہل فن پسند کرتے ہیں، سراہتے ہیں، چونکہ میری شاعری میں سہل ممتنع کی خوبی موجود ہے جو لسانی اعتبار سے تو سادہ اور سلیس ہے لیکن ہم ایسے شعری اور لسانی پینترے کام میں لاتے ہیں کہ اس میں تہہ داری پیدا ہو جاتی ہے۔ خواص تو اس میں سے کئی کئی معنی ڈھونڈ نکالتے ہیں لیکن میرے مخاطب عوام ہیں اس لئے میری زبان بھی سادہ اور سلیس ہے۔

شعر نمبر (۴)

سہل ہے میرؔ کا سمجھنا کیا
ہر سخن اس کا اک مقام سے ہے

مشکل الفاظ:

سہل	=	آسان
مقام	=	بلندی، معیار
سخن	=	شعری کلام

تشریح: آخری شعر میں میؔر بھرپور تعلّی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میری سادہ اور سلیس زبان دیکھ کر فریب میں نہیں پڑ جانا، کہ کہیں تم کو آسانی سے میرا مطلب سمجھ میں آ جائے گا۔ صرف وہی مطلب میں نے اس میں پیش کیا نہیں جو تم سمجھے میؔر کا سمجھنا اتنا آسان نہیں بلکہ ہمارا تو ہر شعری کلام ایک مقام اور معیار سے ہے، ہر سخن کی تہہ تک رسائی کے بعد ہی میؔر کا مدعا سمجھ میں آ سکتا ہے۔ بے تہہ شخص اسے نہیں سمجھ سکتا۔

غزل ۲۵

میؔر دریا ہے سینے شعر زبانی اس کی
اللہ اللہ رے طبیعت کی روانی اس کی
ایک ہے عہد میں اپنے وہ پراگندہ مزاج
اپنی آنکھوں میں نہ آیا کوئی ثانی اس کی
مینھ تو بوچھاڑ کا دیکھا ہے برستے تم نے
اسی انداز سے تھی اشک فشانی اس کی
بات کی طرز کو دیکھو تو کوئی جادو تھا
پر ملی خاک میں سب سحر بیانی اس کی
سرگزشت آپ ہی کس اندوہ سے سب کہتا
تھا
سوگئے تم نہ سنی ہائے کہانی اس کی
آبلے کی سی طرح ٹھیس لگی پھوٹ بہے
درد مندی میں گئی ساری جوانی اس کی
اب گئے اس کے جز افسوس نہیں کچھ حاصل
حیف صد حیف کہ کچھ قدر نہ جانی اس کی

....

شعر نمبر(۱)

میؔر دریا ہے سینے شعر زبانی اس کی
اللہ اللہ رے طبیعت کی روانی اس کی

تشریح: غزل کے مطلع میں میؔر تعلّی برتتے ہوئے اپنے شعر کی تعریف کرتے ہیں کہ میری طبیعت ایسی موزوں ہے کہ جب میرؔ شعر کہتا ہے تو دریا کی طرح بہاؤ آجاتا ہے، جب وہ شعر سنانا شروع کرتا ہے تو پھر کیا کہنا، اللہ اللہ طبیعت رواں ہوجاتی ہے۔

شعر نمبر(۲)

ایک ہے عہد میں اپنے وہ پراگندہ مزاج
اپنی آنکھوں میں نہ آیا کوئی ثانی اس کی

مشکل الفاظ:

عہد = زمانہ
پراگندہ = بکھرا ہوا، شکستہ مزاج
ثانی = دوسری مثال

تشریح: میؔر اپنے مقابلہ میں کسی کو نہیں سمجھتے، خود ہی کہتے ہیں کہ میؔر اپنے زمانے میں ایک مقام رکھتا ہے، دوم وہ ٹھہرا شکستہ مزاج، اس کے مزاج میں پراگندگی حد سے بڑھی ہوئی ہے، وہ اپنی آنکھوں میں کسی دوسرے کو اپنا ثانی نہیں سمجھتا، اپنے پلے کا خیال نہیں کرتا۔

شعر نمبر(۳)

مینھ تو بوچھاڑ کا دیکھا ہے برستے تم نے
اسی انداز سے تھی اشک فشانی اس کی

مشکل الفاظ:

مینھ = بارش

اشک فشانی = آنسو برسانا

تشریح: میؔر ایسا تباہ حال، برباد تھا، کیسی کیسی مصیبتوں سے گھرا ہوا تھا، دکھ، درد ظلم و ستم ہمیشہ اس کے ساتھ رہے ہیں، جس کے سبب اس کی آنکھوں سے ایسے آنسو بہتے رہے، جس طرح تم نے دیکھا ہوگا کہ موسلہ دھار بارش برستی ہے۔ اس شعر میں میؔر نے مبالغہ کے پیرائے میں اشک فشانی کی زیادتی کی شدت کا احساس دلانے کی کوشش کی ہے۔

شعر نمبر (۴)

بات کی طرز کو دیکھو تو کوئی جادو تھا
پر ملی خاک میں سب سحر بیانی اس کی

مشکل الفاظ:

طرز = اسلوب

سحر بیانی = جادو بیانی

تشریح: میؔر کا کلام تو ایسا سحر انگیز ہے کہ ہر کوئی اس کی جانب کھینچا جاتا ہے۔ لیکن یہ تمام جادو بیانی اور کلام کی سحر انگیزی خاک میں مل گئی، اس جہان میں تمام عمر خستہ جاں، گرآلود رہا، آرام نہ پاسکا، اب تو مٹی میں مل کے خود ہی خاک ہو گیا۔

شعر نمبر (۵)

سرگزشت آپ ہی کس اندوہ سے سب کہتا تھا
سوگئے تم نہ سنی ہائے کہانی اس کی

مشکل الفاظ:

سرگزشت = ماجرا، احوال، واقعہ، غم زدہ داستان

اندوہ = رنج وغم

تشریح: میؔر خود ہی اپنی آپ بیتی، اپنے پر گذری ہوئی واردات کس رنج وغم اور درد بھرے لہجہ میں کہتا رہا لیکن تم تھے کہ اپنی آرام کی نیند سوتے رہے میؔر کی درد بھری کہانی تم نے نہ سنی۔

شعر نمبر (۶)

آبلے کی سی طرح ٹھیس لگی پھوٹ بہے
درد مندی میں گئی ساری جوانی اس کی

مشکل الفاظ:

آبلہ = چھالا
ٹھیس = چوٹ، ٹھوکر
دردمندی = غم ودکھ

تشریح: جس طرح آلودگی، درد سے بھرے ہوئے آبلے یعنی چھالے کو ہلکی سی ٹھوکر لگے تو پھوٹ پڑتا ہے اسی طرح ہماری جوانی بھی دکھ، غم اور دردمندی میں بہہ گئی۔

شعر نمبر (۷)

اب گئے اس کے جز افسو نہیں کچھ حاصل
حیف صد حیف کہ کچھ قدر نہ جانی اس کی

مشکل الفاظ

جُزافسوس = سوائے افسوس کے
حیف صد حیف = سینکڑوں افسوس، مراد نہایت افسوسناک
قدر = عظمت، عزت، احترام

تشریح: میؔر کے دنیا سے جانے کے بعد، اس کے تباہ و برباد ہونے کے بعد تمھیں خیال آیا ہے کہ ہائے، ہم میؔر کی قدر نہ

کر سکے، جس قدر اور مقام کے وہ لائق تھا، اب سوائے افسوس کے کیا حاصل ہوگا، تو صد ہا بار افسوس کرتے رہو لا حاصل ہے۔

مثنوی ''میرے گھر کا حال''

سبق ۶

اکائی کے اجزا

۱.۱۔ مثنوی ''میرے گھر کا حال''

۱.۲۔ مقصد

۱.۳۔ تمہید

۱.۴۔ میرؔ کی مثنویوں کے موضوعات

۱.۵۔ مثنوی ''میرے گھر کا حال'' میں سے نمونے کے طور پر چند اشعار کی تشریح۔

۱.۶۔ مثنوی ''دریائے عشق''

۱.۶.۱۔ مثنوی ''دریائے عشق'' کا خلاصہ

۱.۶.۲۔ تمہید

۱.۶.۳۔ چند اشعار کی تشریح

۱.۷۔ مشق کے لئے اپنی معلومات کی جانچ

۱.۷.۱۔ مثنوی ''دریائے عشق میں سے کوئی پانچ اشعار کی تشریح کیجئے؟

۱.۷.۲۔ نامکمّل اشعار کو پورا کیجئے۔

مثنوی ''میرے گھر کا حال''

کیا لکھوں میرؔ اپنے گھر کا حال
گھر کہ تاریک و تیرہ زنداں ہے
کوچۂ موج سے بھی آنگن تنگ
چار دیواری سو جگہ سے خم
لونی لگ لگ کے جھڑتی ہے ماٹی
کیا تھمے مینھ سَقف چھلنی تمام
اس چکش کا علاج کیا کریے
جانہیں بیٹھنے کو مینھ کے بیچ
آنکھیں بھر لا کے یہ کہیں ہیں سب
جھاڑ باندھا ہے مینھ نے دن رات
باؤ میں کانپتے ہیں جو تھر تھر
کیچ لے لے کے جوں تو چھوپا ہے
لِس کو پھر پت چھتی بھی ہے ہی نہیں
ڈھانکو دیوار یا اٹھا رکھو
ایک حجرہ جو گھر میں ہے واثِق
کہیں سوراخ ہے کہیں ہے چاک
کہیں گھونسوں نے کھود ڈالا ہے
کہیں گھر ہے کِسو چھچھوندر کا
کہیں مکڑی کے لڑکے ہیں جالے

اس خرابے میں مَیں ہوا پامال
سخت دل تنگ یوسفِ جاں ہے
کوٹھری کے حباب کے سے ڈھنگ
تر تنک ہو تو سوکھتے ہیں ہم
آہ کیا عمر بے مزہ کاٹی
چھت سے آنکھیں لگی رہے ہیں مدام
راکھ سے کب تلک گڑھے بھریے
ہے چکش سے تمام ایواں کیچ
کیوں کہ پردہ رہے گا یا رب اب
گھر کی دیواریں ہیں‌گی جیسے پات
ان پہ رڈّا رکھے کوئی کیوں کر
چھونپا کاہے کاہے تھوپا ہے
ٹوٹا اک بوریا سا ڈالو کہیں
یا ہمارے لیے بچھا رکھو
سو شکستہ تراز دلِ عاشق
کہیں جھڑ جھڑ کے ڈھیر سی ہے خاک
کہیں چوہے نے سر نکالا ہے
شور ہر کونے میں ہے مچھر کا
کہیں جھینگر کے بے مزہ نالے
کونے ٹوٹے ہیں طاق پھوٹے ہیں
اینٹ چونا کہیں سے گرتا ہے
رکھ کے دیوار ایدھر اودھر سے

چارپائی جب اس میں بچھوائی

سامِّ ابرص کہ بے دوائے خراج

پیکر اپنی خدا نے رکھی ہے

آگے اس حجرے کے ہے اک ایواں

کڑی تختے سبھی دھوئیں سے سیاہ

کبھو کوئی سنپولیا ہے پھرے

کوئی تختہ کہیں سے ٹوٹا ہے

دب کے مرنا ہمیشہ مدِّ نظر

مٹی تودہ جو ڈالی چھت پر ہم

مضطرب ہو کے جو بچھائی بہت

پر سے اس مٹی میں کرختی ہے

دی ہیں اڑواڑیں پھر جو حد سے زیاد

اینٹ مٹی کا در کے آگے ڈھیر

جیتے ہیں جب تلک نہیں پہنچے

کنگنی دیوار کی نپٹ بے حال

توتا مینا تو ایک بابت ہے

پتھر اپنی جگہ سے چھوٹے ہیں

جی اسی حجرے ہی میں پھرتا ہے

لا کے یا رب بناؤں کس گھر سے

پہلے چلپا سہ ہی نظر آئی

ہر جگہ یاں سے ہے نمایاں آج
ڈانس ایک ایک جیسے مکھّی ہے
وہی اس تنگِ خلق کا ہے مکاں
اس کی چھت کی طرف ہمیشہ نِگاہ
کبھو چھت سے ہزار پا ہے گرے
کوئی داسہ کہیں سے چھوٹا ہے
گھر کہاں صاف موت ہی کا گھر
تھے جو شہتیر جوں کہاں ہیں خم
ہر کڑی نے کڑی اٹھائی بہت
تختہ تختہ ہوئی یہ سختی ہے
چل ستوں سے مکاں دے ہے یاد
گِرتی جاتی ہے ہولے ہولے منڈیر
ورنہ کیا بس ہے جو یہیں پہنچے
پِڑری کا بوجھ بھی سکے نہ سنبھال
پودنا پھُدکے تو قیامت ہے
کیوں کہ ساون کٹے گا اب کی بار
ہو گیا ہے جو اتّفاق ایسا
ہو کے مضطر لگے ہیں کہنے سب
تیتری یاں جو کوئی آتی ہے
نہیں دیوار کا یہ اچھا ڈھنگ

ایک دن ایک کوّا بیٹھا
چیل سے لوگ دوڑے کرتے شور
ہو نہ ایسا کہ اپنی چال چلے
نہیں وہ زاغ چارپاؤں پھرا
مٹی اس کی کہیں کہیں بھسکی
سان کر خاک لگ گئے دو چار
اچھے ہوں گے کھنڈر بھی اس گھر سے
اُکھڑے پکھڑے کواڑ ٹوٹی وصید
خاک لوہے کو جیسے کھاوے پاک
بند رکھتا ہوں در جو گھر میں رہوں
گھر بھی پھر ایسا جیسا ہے مذکور
جس سے پوچھو اسے بتا دے شتاب
ایک چھپّر ہے شہرہ دلّی کا
بانس کی جادیے تھے سرکنڈے
تھر تھراوے بھنبھیری سی دیوار
شاق گزرے ہے کیا کہوں کیسا
اُڑ بھنبھیری کہ ساون آیا اب
جانِ محزوں نگل ہی جاتی ہے
کہیں کھسکے تو ہے قیامت تنگ
بے گماں جیسے ہوّا آ بیٹھا

کہ نہ حائط میں کچھ رہا تھا زور
دوڑے اُچھلے کہ ہال ہال چلے
ایک کالا پہاڑ آن گرا
جی ڈہا اور چھاتی بھی دھسکی
بارے جلدی درست کی دیوار
برسے ہے اک خرابی گھر در سے
زلفی زنجیر ایک کہنہ حدید
چھیڑ لیجے تو پھر نری ہے خاک
قدر کیا گھر کی جب کہ میں ہی نہ ہوں
ہے خرابی سے شہر میں مشہور
ساری بستی میں ہے یہی تو خراب
جیسے روضہ ہو شیخ چلّی کا
سَودے مینھوں میں سب ہوئے ٹھنڈے
گل کے بندھن ہوئے ہیں ڈھیلے سب
مینھ میں کیوں نہ بھیگیے یک سر
مٹی ہو کر گرا ہے سب والا
واں پہ ٹپکا تو یاں سرک بیٹھا
حال کس کو ہے اولتی کا یاد
کہیں صحنک رکھوں کہیں پیالا
ٹپکے دوچار جا تو بند کروں

یاں تو جھانکے ہزار مَیں تنہا
بس کہ بدرنگ ٹپکے ہپانی
کوئی جانے کہ ہولی کھیلا ہوں
مجھ سا کیا واقعی ہوا چارہ
بان جھینگر تمام چاٹ گئے
تنکے جاں دار ہیں جو بیش و کم
ایک کھینچے ہے چونچ سے کر زور
پوچھ مت زندگانی کیسی ہے
کیا کہوں جو جفا چِکش سے سہی
بوریا پھیل کر بچھا نہ کبھو
ڈیوڑھی کی یہ خوبی در ایسا
جنس اعلیٰ کوئی کھٹولا کھاٹ
پاکھے رہنے لگے ہیں گیلے سب
پھوس بھی تو نہیں ہے چھپّر پر
وہ رہے یاں جو ہووے ڈھب والا
یاں جو بھیگا تو واں تنک بیٹھا
مگری اس جھگڑے میں گئی برباد
کہیں ہانڈی کے ٹھیکرے لالا
پیچ کوئی لڑاؤں فُند کروں
کچھ نہیں ہائے مجھ سے ہو سکتا

کپڑے رہتے ہیں میرے افشانی
کوئی سمجھے ہے یہ کہ خیلا ہوں

آسماں جو پھٹے تو کیا چارہ
بھیگ کر بانس پھاٹ پھاٹ گئے

اُن پہ چڑیوں کو جنگ ہے باہم
ایک مگھڑے پہ کر رہی ہے شور

ایسے چھپّر کی ایسی تیسی ہے
چارپائی ہمیشہ سر پہ رہی

کونے ہی میں کھڑا رہا یک سو
چھپّر اس چوچلے کا گھر ایسا

پائے پٹی رہے ہیں جن کے پھاٹ
کھٹملوں سے سیاہ ہے سو بھی

شب بچھونا جو میں بچھاتا ہوں
کیڑا اک ایک پھر مکوڑا ہے

ایک چٹکی میں ایک چھنگلی پر
گرچہ بہتوں کو میں مَسل مارا

ملتے راتوں کو گھِس گئیں پوریں
ہاتھ تکیے پہ گہہ بچھونے پر

سَلسَلایا جو پائینتی کی اور
تو شک اِن رگڑوں ہی میں سب پھاٹی

جھاڑتے جھاڑتے گیا سب بان

نہ کھٹولا نہ کھاٹ سونے کو

جب نہ تب پنڈے پر لپے پائے

سوتے تنہا نہ بان میں کھٹمل

کہیں پھرکا کہ جی سے تاب گئی

ایک ہتھیلی پہ ایک گھائی میں

ہاتھ کو چَین ہو تو کچھ کہیئے

یہ جو بارش ہوئی تو آخرکار

آہ کھینچی خرابی کیا کیا نہ

ایسے ہوتے ہیں گھر میں تو بیٹھے

چَین پڑتا نہیں ہے شب کو بھی

سر پہ روزِ سیاہ لاتا ہوں

سانجھ سے کھانے ہی کو دوڑا ہے

اک انگوٹھا دکھادے انگلی پر

پر مجھے کھٹملوں نے مِل مارا

ناخنوں کی ہیں لال سب کوریں

کبھو چادر کے کونے کونے پر

وہیں مسلا، کر ایڑیوں کا زور

ایڑیاں یوں رگڑتے ہی کاٹی

ساری کھاٹوں کی چولیں نکلیں ندان

پائے پٹی لگائے کونے کو
سیتلا کے سے دانے مرجھائے
آنکھ، منھ، ناک، کان، میں کھٹمل
آنکھ سے تاپگاہ خواب گئی
سینکڑوں ایک چارپائی میں
کب تلک یوں ٹٹولتے رہیے
اس میں سی سالہ وہ گری دیوار
تھے جو ہمسائے وَے ہیں ہم خانہ
جیسے رستے میں کوئی ہو بیٹھے
دو طرف سے تھا کتّوں کا رستا
ہو گھڑی دو گھڑی تو دُتکاروں
چار جاتے ہیں چار آتے ہیں
کس سے کہتا پھروں یہ صحبت نغز
وہ جو ایواں تھا حجرے کے آگے
کوٹھا بوجھل ہوا تھا بیٹھ گیا
کڑی تختہ ہر ایک چھوٹ پڑا
میں تو حیران کار تھا اپنا
اینٹ پتھر تھے مٹی تھی یکسر
چرخ کی کج روی نے پیسا تھا
کتنے اک لوگ اس طرف دھائے

مٹی لے لے گئے وہ ہاتھوں میں
صورت اس لڑکے کی نظر آئی
آنکھ کھول اِدھر اُدھر دیکھا
قدرتِ حق دکھائی دی آکر
داشت کی کوٹھری میں لا رکھا
مومیائی کھلائی کچھ بلدی
غم ہوا سُن کے دوست داروں کو
کہ مِری بود و باش یاں نہ رہے
کاش جنگل میں جا کے میں بستا
ایک دو کُتّے ہوں تو میں ماروں
چار عف عف سے مغز کھاتے ہیں
کتّوں کا سا کہاں سے لاؤں مغز
اس کے اجزا بکھرنے سب لاگے
پانی جزجز میں اس کے پَیٹھ گیا
ناگہاں آسمان ٹوٹ پڑا
کوئی اس دم نہ یار تھا اپنا
خاک میں مل گیا تھا گھر کا گھر
پر خُدا مجھ سے میرا سیدھا تھا
یا مَلَک آسمان سے آئے
کام نے شکل پکڑی باتوں میں

ہم جو مرتے تھے جان سی پائی

اس خرابی کو بھر نظر دیکھا

یعنی نکلا درست وہ گوہر

گھر کا غم طاق میں اٹھا رکھا

فرصت اس کو خدا نے دی جلدی

پھر بندھا یہ خیال یاروں کو

گو تصرف میں یہ مکاں نہ رہے

شہر میں جا بہم نہ پہنچی کہیں

اب وہی گھر ہے بے سر و سایہ

دن کو ہے دھوپ رات کو ہے اوس

قصّہ کوتاہ دن اپنے کھوتا ہوں

چار و ناچار پھر رہا میں وہیں

اور میں ہوں وہی فرو مایہ

خوابِ راحت ہے یاں سے سَو سَو کوسوں

رات کے وقت گھر میں ہوتا ہوں

نہ اثر بام کا نہ کچھ در کا!!

گھر ہے کاہے کا نام ہے گھر کا

در ہَجوِ خانۂ خود

کہ بہ سببِ شدگِ باراں خراب شدہ بود

جسمِ خاکی میں جس طرح جاں ہے
ظلمتیں اس کی سب پہ روشن ہیں
ہے جو سرکوب اک بڑی دیوار
بختِ بد دیکھ سارے پرنالے
اب جو آیا ہے موسمِ برسات
صحن میں آب نیزہ بالا ہے
مینھ میں گھر کے پانچ چھ چھپّر
پر تلک تنکے تھے کچھ ایک نئے
دل ہے کچھ مکڑیوں کا احساس مند
اس طرح خانہ ہم پہ زنداں ہے
زندہ در گور ہم کئی تن ہیں
واں سے جھانکو تو ہے اندھیرا غار
اس کے معمار نے اِدھر ڈھالے
دن کو ہے اپنے ہاں اندھیری رات
کوچۂ موج ہے کہ نالہ ہے
ہم غریبوں کے ہوتے ہیں سر پر
سووَے چڑیوں کے گھونسلوں کو گئے
کہ جنھوں نے کیے ہیں جھانکے بند
پھوس کچھ ہے کہیں سو آٹا ہے
اُڑ گئی گھاس مٹی ہے والا

اپنے بندھن سے جو کہ چھوٹا ہے
کیا کہوں آہ گھر ہے کہنے کو
بند جھانکوں کو کیجیے تاکے
ٹھیکی دینے کو جا اڑے ہیں ہم
ٹٹّیاں تھیں جو آگے چھپّر کے
تا گلے سب کھڑے ہیں پانی میں
اب تو اپنا بھی حال بدتر ہے
پانی بہہ کر جھکا جو ہے دالان
چاک اس ڈول سے ہے ہر دیوار
متصل ٹپکے ہے نہ باراں ہے
گھر کی صورت جو اَور ہوتی ہے
مینھ یک بارگی جو ٹوٹ پڑا
داسے پایانِ کار ٹوٹ بہے
بہہ گئے گولے تختے ڈوب گئے
موجِ خشتی ستون میں پیٹھی
بانس کو جھینگروں نے چاٹا ہے
ہے جو بندھن سو مکڑی کا جالا
ہم پہ گویا وہ بانس ٹوٹا ہے
باندھتا ہوں مچان رہنے کو
یاں تو یک آسمان ٹوٹا ہے

سر پہ ٹھٹھر لیے کھڑے ہیں ہم

بہتی پھرتی ہیں صحن میں گھر کے

خاک ہے ایسی زندگانی میں

سر پہ گٹھڑی ہے تِس پہ چھپّر ہے

سر پہ رہتا ہے طرّۂ ایوان

جیسے چھاتی ہو عاشقوں کی فِگار

گریۂ زارِ سوگواراں ہے

چھت بھی بے اختیار روتی ہے

کڑی تختہ ہر ایک چھوت پڑا

طاقچے پھر رہے تھے پھوٹ بہے

غرض اجزائے سَقف خوب گئے

جانِ غم ناک خون میں بیٹھی

۱.۲ مقصد :

اس اِکائی کا مقصد یہ ہے کہ آپ کو نصاب میں شامل مثنوی کی فنّی اور شعری خوبیوں سے متعارف کروایا جائے۔اس اکائی کے مطالعے کے بعد طلبا سے توقع کی جاتی ہے کہ :

۱۔ وہ مثنوی ''میرے گھر کا حال'' کے موضوع پر اِظہارِ خیال کریں۔

۲۔ مثنوی کی تشریح ،فنّی و مفہوم سے واقف ہوں۔

۳۔ مطالعہ اور مشاہدہ سے اظہارِ خیال کریں۔

تمہید :

میر تقی میؔر کا کمالِ شاعری بُنیادی طور پر صنفِ غزل میں ظاہر ہوا ہے لیکن ان کی شخصیت کو مکمل طور پر سمجھنے کے لئے ان کی مثنویات کا مطالعہ ضروری ہے کیوں کہ مثنویوں میں ان کی ذات کا انکشاف زیادہ کھل کر ہوا ہے۔ اب تک میر کی ۳۷ مثنویاں سامنے آچکی ہیں جن میں سے ۳۴ مثنویاں کلیاتِ میؔر میں ہیں اور باقی تین مثنویاں ڈاکٹر گیان چند جین نے دریافت کی ہیں۔ جو کلیاتِ میؔر حصّہ دوم میں شامل ہیں۔ میؔر کی ان تمام مثنویوں کو موضوعات کے اعتبار سے چار عنوانات میں تقسیم کیا جاتا ہے :

(ا) عشقیہ (ب) واقعاتی (ج) مدحیہ (د) ہجویہ

مثنوی ''میرے گھر کا حال'' ہجویہ مثنوی ہے لیکن اسے میؔر کی سوانح نامہ بھی کہا جاتا ہے اور ساتھ میں اسے شہر دہلی کے سوانح نامہ سے بھی الگ نہیں دیکھا جاسکتا ہے۔ اس مثنوی میں میؔر نے اپنی ذات کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کے ماحول کو بھی ہجو کا نشانہ بنایا ہے۔ اس ہجو سے ایک ایسی تصویر اُبھرتی ہے کہ ایک نقاش میؔر کے مکان اور رہن سہن کی تصویر آج بھی بنا سکتا ہے۔ اپنے گھر کی ہجو لکھتے وقت میؔر کو اپنی عظمت کا بھی احساس تھا کہ اس معاشرے کا سب سے بڑا شاعر ایسی خستہ حالی میں زندگی گُزار رہا ہے۔ اس کا گھر ایسا ہے جس میں ہر دم دب مرنے کا خیال رہتا ہے۔ اس گھر کی چھت بیٹھ گئی اور ان کا اس کے نیچے دب گیا۔ یہ دیکھ کر لوگ بھاگ کر آئے اور مٹی کو ہاتھوں سے ہٹا کر میؔر کے بیٹے کو وہاں سے نکالا۔

مثنوی کا مطالعہ اور مشاہدہ اثر و تاثیر پیدا کرتا ہے اس میں تخیل نہیں ہے بل کہ وہ تلخی اور بیزاری ہے جو اس گھر کے جہنم میں رہنے سے پیدا ہوئی ہے جو اس عہد کی سیاست و معاشرت کی دین تھی۔

تشریح :

1۔ میر تقی میؔر اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ میں اپنے اس گھر کا حال کیا بیان کروں جو گھر نہیں بل کہ ایک ویرانہ ہے اور اسی ویرانے نے مجھے بھی خستہ حال کر دیا ہے۔

2۔ شاعر کہتے ہیں کہ گھر اس قدر تاریک ہے جیسے چاہِ زنداں اور میرا دل یوسفِ سخت جاں کی طرح تنگ ہے۔

اس شعر میں شاعر نے صنعتِ حُسنِ تلمیح سے کام لیا ہے۔ شاعر نے حضرت یوسفؑ کے اُس تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے جب حضرت کو ان کے سوتیلے بھائیوں نے ان کے والدِ محترم سے دُور ایک سیاہ چاہ میں قید کیا تھا۔ جہاں حضرت یوسفؑ عرصۂ دراز تک تکلیف میں رہے۔ اب یہاں میرؔ اپنے ہی گھر میں قید ہیں، انھیں کس نے یہاں رکھا۔ گویا یہ اس عہد کے حالات ہی بیان کریں گے۔ شاعر نے اس شعر میں اپنے عہد پر طنز کیا ہے۔

3۔ ہر کسی کی خواہش ہوتی ہے کہ گھر کے سامنے کھُلا آنگن بھی ہو۔ لیکن میرؔ اپنی تمنّا کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

یہاں وقت گُزاری کے لئے آنگن بھی نہیں ہے اور اندھیری کوٹھری میں شیشے کے باریک کنول روشنی کا کام دے رہے ہیں۔

4۔ مکان کی چار دیواری سینکڑوں جگہ جھُکی ہوئی خمیدہ ہے اور اگر بارش کی وجہ سے یہ تھوڑی سی گیلی ہو جائے تو ہم گھبرا جاتے ہیں کہ کہیں یہ گر نہ جائے

5۔ دیواروں پر لگی نمکین مٹی دیواروں سے لگاتار گر رہی ہے۔ یہ دیکھ کر میرؔ ایک سرد آہ! بھرتے ہوئے کہتے ہیں کہ عمر ساری بے مزہ کٹ گئی۔

6۔ میرؔ کے گھر کی چھت کچی تھی اس لئے کہتے ہیں کہ تیز بارش سے گھر کی چھت چھلنی ہو گئی اور ہم لگاتار چھت کو دیکھتے رہ جاتے ہیں کہ بارش کب تھمے۔

7۔ چھت چھلنی ہونے کی وجہ سے بارش کا پانی اندر ٹپک رہا ہے اب اس کا علاج کیا ہو سکتا ہے کب تک مٹی سے چھت کے سوُراخ بھرتے رہیں گے۔

8۔ چھت سے پانی اس قدر اندر آیا کہ کہیں بھی بیٹھنے کو جگہ نہیں ہے۔ تمام گھر کیچڑ اور دلدل سے بھرا ہوا ہے۔

9۔ جو بھی اس مکان کی حالت دیکھتا ہے اُس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے اللہ اب اہلِ خانہ کا پردہ اس گھر میں کس طرح باقی رہے گا جہاں دن رات بارش ہوتی ہے۔

10۔ دن رات مسلسل بارش ہونے کی وجہ سے چھت چھلنی ہوگئی، پانی اندر آ گیا اور کچھ پانی دیواروں میں اس طرح جذب ہوگیا کہ دیواروں پر باریک سبز پودا اُگ آئی۔ میؔر نے اس شعر میں دیواروں کو سبز پتّے سے تشبیہہ دی ہے کہ دیواروں کا رنگ پانی کی وجہ سے سبز پتّے کی طرح بن گیا ہے۔

11۔ دیواریں ہوا میں کانپتی اور تھرتھراتی نظر آتی ہیں ان پر نئی تعمیر کے لئے ایک اینٹ بھی نہیں رکھ سکتے۔ یعنی اب دیوار یک اینٹ کا بوجھ بھی نہیں برداشت کرسکتی۔

12۔ ہَوا میں تھرتھرانے والی کمزور اور کھُردری دیواروں کو کیچڑ اور گارہ تھوپ کرسوُ راخ بند کِئے ہیں۔

13-14۔ مزید یہ کہ اس کھُردری دیوار میں ساز وسامان رکھنے کا کوئی تختہ بھی نہیں ہے جس سے دیوار یا چھت کو ھچا سکتے۔ صرف ایک پھٹا ہوا بوریا ہے۔ اس کو کہاں کہاں استعمال کریں۔ دیواروں پر ڈالیں یا خود کے لئے بچھائیں؟

15۔ گھر میں جو مضبوط کمرہ ہے اُس کی حالت عاشق کے دل کی طرح شکستہ ہے۔ جس کی منظر کشی میؔر نے بہت ہی عمدہ انداز میں کی ہے۔ گھر کا منظر کچھ یوں بیان کیا ہے جیسے ہم خود اس کمرے میں بیٹھ کر ہر چیز دیکھ رہے ہیں۔

16۔ کمرے کی حالت شاعر بیان کر رہے ہیں کہ کہیں سوُ راخ ہے، کہیں فرش پھٹا ہوا ہے اور کہیں دیواروں سے مٹی اِتنی زیادہ گری ہے کہ ڈھیر جمع ہوئے ہیں۔

17۔ کسی جگہ بڑے چوہے نے کھدائی کی ہے اور کہیں چوہے سوُ راخ سے سر باہر نکال رہے ہیں۔

18۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ گھر کسی انسان کا نہیں بل کہ بدبودار چوہے کا ہے جہاں اس کی بدبو سے مچھروں سے گھر بھرا ہوا ہوتا ہے اور ہر کونے میں شور کرتے رہتے ہیں۔

19۔ اس گھر میں کہیں مکڑی کے جالے لٹکے ہوئے ہیں اور کہیں نمی سے پیدا ہونے والے کیڑے جھینگر کے بے مزہ نالے سُنائی دیتے ہیں۔

20۔ جگہ جگہ دیواروں کے کونے ٹوٹے ہیں، طاق پھوٹے ہیں اور پتھر اپنی جگہ سے چھوٹ کر گرتے ہوئے نظر آ

رہے ہیں۔

21۔ اینٹ اور چونا کہیں سے گرتا ہے۔اتنا کچھ ہونے کے باوجود بھی اسی کمرے میں رہنا پڑتا ہے، دن رات جی اس کمرے کا طواف کرتا رہتا ہے۔

22۔ شاعر اللہ کی بارگاہ میں فریاد کرتے ہیں کہ یارب اب میں ایدھر اودھر سے کون سی دیوار رکھ کر گھر تعمیر کروں۔ وہ دیواریں کہاں سے لاؤں۔میرؔ کی یہ سرد آہ! دل کو چھوُ جاتی ہے۔

23۔ جب اس گھر میں چارپائی بچھوائی تو سب سے پہلے یہاں چھپکلی نمودار ہوئی۔

24۔ زہریلی اور کوڑھ جیسی لاعلاج بیماریاں ہر جگہ اس گھر سے ظاہر ہو رہی ہیں۔

25۔ گھر کے اندر مچھر اتنے بڑے بڑے داخل ہوئے ہیں کہ ان کا قد مکھی کی طرح ہے انھیں دیکھ کر لگتا ہے کہ یہ مچھر نہیں مکھیاں ہیں۔

26۔ اس کمرے کے آگے ایک گھر ہے جو اس (میرؔ) مفلس، درویش کا گھر ہے۔

27۔ اس گھر کی چھت کے شہتیر سبھی دھوئیں سے سیاہ ہیں جن پر ہر وقت نگاہیں جمی رہتی ہیں کہ نہ جانے کب چھت سے کیا آن گرے۔

28۔ اس چھت سے کبھی کوئی سانپ کا بچہ پھرتا ہے کبھی یہاں سے کوئی ایسا کیڑا گرتا ہے جس کے ہزار پیر ہوں۔

29۔ چھت کا کوئی تختہ کہیں سے ٹوٹا ہوا نظر آتا ہے اور کہیں مکان کو سہارا دینے والا لکڑی کا ستوُن الگ ہوتا دکھائی دیتا ہے۔

30۔ گھر کی اس حالت کو دیکھ کر ہمیشہ موت مدِ نظر رہتی ہے، گویا یہ زیست کا گھر نہیں بل کہ موت کا گھر ہے۔ ہر وقت یہی سوچتے رہتے ہیں کہ نہ جانے کب چھت گر جائے اور ہم اس میں زندہ دفن ہو جائیں۔

31۔ چھت کی حالت سُدھارنے کے لئے جب اس پر مٹی ڈالی تو شہتیر اس مٹی کا بوجھ برداشت نہیں کر سکے اور ان کی حالت کمان جیسی ہوگئی۔یعنی وہ جھک گئے۔

32۔ بے چین اور مضطرب ہوکر جو زیادہ مٹی بچھائی تو دیکھا کہ ہر شہتیر پر بوجھ زیادہ ہے جو مسلسل اس تکلیف کو برداشت کر رہے ہیں۔

33۔ اب چھت پر زیادہ مٹی بھی نہیں ڈال سکتے کیوں کہ یہ چھت کو ڈھانپنے کے بجائے اس کی حالت کمزور کر رہی ہے۔

34۔ چھت کی مضبوطی کے لئے جو حد سے زیادہ لکڑی کے کھمبے نصب کئے گئے ہیں ان کو دیکھ کر لگتا ہے کہ یہ مکان نہیں ہے بل کہ خالص ستونوں سے بنایا ہوا کوئی کمزور چھپّر ہے۔

35۔ دیواروں سے مُسلسل گرنے والی مٹی کی وجہ سے دروازے کے سامنے ڈھیر جمع ہو گیا ہے اور کہیں کہیں دیواروں کے درمیان سے اینٹیں بھی گر رہی ہیں۔

36۔ نہایت مایوسی کے عالم میں میؔر کہہ رہے ہیں کہ آج تک جو عمر بسر کی اس خانۂ خراب میں رہے اور جو باقی ماندہ عُمر ہے وہ بھی اسی خستہ حال مکان میں گُزارنی ہے۔

37۔ دیواروں کے کنارے اس قدر کمزور ہیں کہ ایک چادر کا بوجھ بھی نہیں سنبھال سکیں۔

38۔ توتا، مینا جیسے پرندوں کا وزن بھی یہ دیوار سنبھال نہیں سکتی۔ توتا مینا کی تو بات ہی نہیں اگر کبھی پودنا جیسا چھوٹا پرندہ دیوار پر بیٹھ جائے تو قیامت برپا ہو جاتی کہ اب دیوار گر جائے گی۔

39۔ ساون کے آتے ہی دیواریں پتنگوں کی صورت تھر تھراتی رہتی تھیں اور فکر رہتی تھی کہ اس بار ساون کیسے کٹے گا۔

40-41۔ اب اتفاق کچھ ایسا ہو گیا ہے کہ ہمیں فکر لاحق ہو گئی ہے سبھی لوگ پتنگوں کو اُڑانے کے لئے کہہ رہے ہیں۔ جس سے ہمیں پریشانی ہو جاتی ہے۔

42۔ اگر کبھی کوئی تیتری اُڑ کر دیوار پر بیٹھ جائے تو جان کے لالے پڑ جائیں گے۔ اُڑتی ہوئی تیتری کو دیکھتے رہ جاتے ہیں کہ کہیں یہ دیوار پر بیٹھ کر قیامت نہ برپا کر دے۔

43۔ دیوار کی یہ خستہ حالت دیکھ کر فکر مند ہو جاتے ہیں کہ کہیں یہ کھسک کر قیامت نہ برپا ہو جائے۔

44۔ ایک دن دیوار پر ایک کوّا بے فِکر ہو کر آ کے بیٹھا۔

۱.۵ مشق کے لئے اپنی معلوٗمات کی جانچ۔

۱.۵.۱ مثنوی ''میرے گھر کا حال'' میں سے کوئی پانچ اشعار کی تشریح کیجئے۔

۱.۵.۲ مثنوی میں سے اپنے پسندیدہ کوئی پانچ اشعار منتخب کیجئے۔

۱.٦ مندرجہ ذیل اشعار کو مکمل کیجئے۔مثنوی ''میرے گھر کا حال''

۱.٦.۱ اینٹ چونا کہیں سے گرتا ہے ....

۱.٦.۲ دو طرف سے تھا کتّوں کا رستا ....

۱.۷ نیچے کچھ نامکمل شعر دئے گئے ہیں، آپ کو نیچے دئے گئے الفاظ کی مدد سے انہیں پورا کرنا ہے۔

۱.۷.۱ ....

....

مثنوی ''دریائے عشق''

سبق ۷

عِشق ہے تازہ کار تازہ خیال
دل میں جا کر کہیں تو درد ہوا
کہیں آنکھوں سے خون ہو کے بہا
کہیں رونا ہوا ندامت کا
گہہ نمک اُس کو داغ کا پایا
واں طپیدن ہوا جگر کے بیچ
کہیں آنسو کی یہ سرایت ہے
تھا کسی دل میں نالۂ جانکاہ
تھا کسو کی پلک کی غمناکی
کہیں باعث ہے دل کی تنگی کا
کہیں اندوہ جان آگہ تھا
کہیں عشاق کی نیاز ہوا
ہے کہیں دل جگر کی بیتابی
کسو چہرے کا رنگ زرد ہوا
طور پر جا کے شعلہ پیشہ رہا
کہیں نے بست کو لگائی آگ
کبھو افغان مرغ گلشن تھا
کسو مسلخ میں جا قندارہ ہوا

ہر جگہ اس کی اک نئی ہے چال
کہیں سینے میں آہ سرد ہوا
کہیں سر میں جنون ہوکے رہا
کہیں ہنسنا ہوا جراحت کا
گہہ پتنگا چراغ کا پایا
یاں تبسم ہے زخمِ تر کے بیچ
کہیں یہ خونچکاں شکایت ہے
ہے کسو لب پہ ناتواں اک آہ
ہے کسو خاطروں کی غمناکی
کہیں موجب شکستہ رنگی کا
سوزش سینہ ایک جا گہہ تھا
کہیں اندوہ جاں گداز ہوا
تھا کسو مضطرب کی بیخوابی
کسو محمل کی رہ کی گرد ہوا
جیتوں میں شرار تیشہ رہا
کہیں تیغ وگلو میں رکھی لاگ
کبھو قمری کا طوق گردن تھا
کوئی دل ہو کے پارہ پارہ ہوا
ایک عالم میں دردمندی کی
ایک دل سے اُٹھے ہے ہو کر دود
اک زمانے میں دل کی خواہش تھا
کہیں بیٹھے ہے جی میں ہو کر چاہ

خار خارِ دِلِ غریباں ہے
کہیں شیون ہے اہلِ ماتم کا
آرزو تھا اُمیدواروں کی
نمک زخم سینہ ریشاں ہے
حسرت آلود آہ تھا یہ کہیں
کشش اس کی ہے ایک اعجوبہ
کون محرومِ وصل یاں سے گیا
کام میں اپنے عشق پکّا ہے
جس کو ہو اُس کی التفات نصیب
ایسی تقریب ڈھونڈھ لاتا ہے
ایک محفل میں جا پسندی کی
ایک لب پر سخن ہے خون آلود
اک سمیں میں جگر کی کاہش تھا
کہیں رہتا ہے قتل تک ہمراہ
انتظارِ بلا نصیباں ہے
کہیں نوحہ ہے جان پر غم کا
دردمندی جگر نگاروں کی
نگہہ یاس مہرکیشاں ہے
شوق کی یک نگاہ تھا یہ کہیں
ڈوبا عاشق تو یار بھی ڈوبا
کہ نہ یار اُس کا پھر جہاں سے گیا
ہاں یہ نیرنگ ساز پکّا ہے

ہے وہ مہمانِ چند روزہ غریب
کہ وہ ناچار جی سے جاتا ہے

آغاز قصّۂ جانگداز

ایک جا اک جوان رعنا تھا
عشق رکھتا تھا اُس کی چھاتی گرم
شوق تھا اُس کو صورتِ خوش سے
تھا طرحدار آپ بھی لیکن
کوئی ترکیب اگر نظر آتی
لالہ رخسار و سر و بالا تھا
دل وہ رکھتا تھا موم سے بھی نرم
اُنس رکھتا تھا وضعِ دلکش ہے
رہ نہ سکتا تھا اچھی صورت بن
صورتِ حال اور ہو جاتی
دیکھتا گر وہ کوئی خوش پُرکار
زلف ہوتی کسو کی گر برہم
دیکھتا گر کہیں وہ چشمِ سیاہ
سر میں تھا شور شوق دل میں تھا
الغرض وہ جوانِ خوش اسلوب
ایک دن بے کلی سے گھبرایا
کسو گل پاس وہ صنم ٹھہرا
اک خیابان میں سے ہو نکلا

نہ تسلّی ہوا دلِ بیتاب
دل کی واشد سے بے توقع ہو
دیکھ گلشن کو نا اُمیدانہ
دل کے رُکنے کا اُس کو اک غم تھا
ناگہہ اُس کوچہ سے گزار ہوا
ایک غرفے سے ایک مہ پارہ
پڑ گئی اُس پہ اک نظر اُس کی
تھی نظر یا کہ جی کی آفت تھی
ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ
بیقراری نے کج ادائی کی
مُنھ جو اُس کا طرف سے اس کے پھرا
وہ تو رکھتی نہ تھی خیال اُس کا
جھاڑ دامن کے تیئں وہ مہہ پارہ
رہتا خمیازہ کش ہی لیل و نہار
دیکھتے اُس کے حال کو درہم
دل سے بے اختیار کرتا آہ
عشق ہی اُس کے آب و گل میں تھا
ناشکیبا رہے تھا بے محبوب
سیر کرنے کو باغ میں آیا
کہیں سبزے میں ایک دم ٹھہرا
ایک سائے تلے سے رو نکلا
نہ تھما چشمِ تر سے خونِ ناب

ہر شجر کے تلے بہت سارو
مُنھ کیا اُن نے جانب خانہ
راہ چلنے میں خیال درہم تھا
آفت تازہ سے دو چار ہوا
تھی طرف اُس کے گرم نظارہ
پھر نہ آئی اُسے خبر اُس کی
وہ نظر ہی وداعِ طاقت تھی
صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ
تاب و طاقت نے بے وفائی کی
مضطرب ہو کے خاک پر یہ گرا
بیطرح ہووے گو کہ حال اُس کا
اُٹھ گئی سامنے سے یکبارہ
وہ گئی اُس کے سر بلا آئی
دل پہ کرنے لگا طپیدن ناز
ہاتھ جانے لگا گریباں تک
طبع نے اک جنوں کیا پیدا
سوزشِ دل نے جی میں جاگہہ کی
بسترِ خاک پر گرا وہ زار
خاطر افگار خار خار ہوئی
اپس کے مُنھ پر پڑی جو اُس کی نِگاہ
خو ہوئی نالۂ حزیں کے ساتھ
ہو نٹھ سوکھے تو خونِ ناب ملا

خلق اُس کی ہوئی تماشائی
کچھ کہا گر کسو نے شفقت سے
جا کے اُس کے قریب در بیٹھا
دل نہ سمجھا کہ اضطراب کِیا
جو کہ سمجھے تھے اُس کو دیوانہ
عاشق اُس کو کسو کا جان گئے
کیونکہ باہم معاش تھی سب کی
وارث اُس کے بھی بدگمان ہوئے
مشورت تھی کہ مار ہی ڈالیں
پھر یہ ٹھہری کہ ہونگے ہم بدنام
کیا گنہہ تھا کہ یہ جواں مارا
خاک میں مل گئی وہ رعنائی
رنگ چہرے سے کر چلا پرواز
چاک کے پھیلے پانٔوں داماں تک
اشک نے رنگِ خوں کیا پیدا
داغ نے آ جگر کو آتش دی
درد کا گھر ہوا دل بیمار
جاں تمنّا کش نگار ہوئی
نااُمیدی کے ساتھ ہی سر کی آہ
رابطہ آہِ آتشیں کے ساتھ
خواب و خور دونوں کو جواب ملا
پر نہ وہ دیکھنے کبھو آئی

رو دیا اُن نے ایک حسرت سے
قصد مرنے کا اپنے کر بیٹھا
شوق نے کام کو خراب کیا
رحم کرتے تھے آشنا یا نہ
سب بُرا اس ادا کو مان گئے
ایک جا بود و باش تھی سب کی
در پئے دُشمنِ جان ہوئے
دفعتاً اُس بلا کے تئیں ٹالیں
سُن کے آخر کہیں گے خاص و عام
کِن نے مارا اُسے کہاں مارا
ہووے یہ خون خفتہ گر بیدار
کیجیے ایک ڈھب سے اس کو تنگ
تہمت خبط رکھیے اُس کے سر
دے کے دیوانہ اُس جواں کو قرار
ایک نے سخت کہہ کے تنگ کِیا
ایک آیا تو ہاتھ میں شمشیر
کی اشارت کہ کو دکانِ شہر
گرچہ ہنگامہ اُس کے سر پر تھا
محو تھا اُس کے یہ خیال کے پیچ
ہونٹھ پر محسن کا بیان اُس کا
ایک دم آہِ سرد بھر اُٹھنا
جی میں کہتا کہ آہ مشکل ہے

دوست کو میرے نام سے ہے ننگ
چشمِ تر سے لہو بہا کرتا
کالے نسیمِ سحر یہ اس سے کہہ
ان بلاؤں میں کوئی کیونکہ جیے
جان دوں تیرے واسطے سو تو
رفتہ رفتہ ہوا ہوں سودائی
نام کو بھی ترِے نہ جانا آہ
نااُمیدانہ گر کروں ہوں نگاہ
سخت مشکل ہے سخت ہے بیداد
کھینچی ہووے خفتِ بسیار
تانہ عاید ہو اپنی جانب ننگ
کیجیے سنگسار اپس کو پھر
ہو گئے سارے در پئے آزار
ایک نے آ کے زیرِ سنگ کِیا
ایک بولا کہ اب ہے کیا تاخیر
آئے لبریز غصّۂ وپر قہر
ایک روئے دل اُس کا اودھر تھا
تھا گرفتار اپنے حال کے پیچ
تھا سرو سنگ آستاں اُس کا
نالہ گرم گاہ کر اُٹھنا
اس طرف یک نگاہ مشکل ہے
دشمنوں سے ہے جی پہ عرصہ تنگ

صبح کے باد سے کہا کرتا
مت تغافل کر اور غافل رہ
جان پر آ بنی ہے تیرے لیے
آنکھ اُٹھا کر ادھر نہ دیکھے کبھو
دور پہونچی ہے میری رسوائی
بجھتے کیونکہ سخن کی نکلے راہ
دیکھتا ہوں ہزار روزِ سیاہ
ایک میں خوں گرفتہ سو جلاّد
کوئی مشفق نہیں کہ ہو وے شفیق
نالہ ہوتا ہے گھہ گھے دل جو
آہ جو ہمدمی سی کرتی ہے
چشم رکھتا ہے وصل کی یہ دل
ورنہ ترکیب یہ کہاں ہوتی
اب ٹھہرتا نہیں ہے پائے ثبات
سنگباراں سے سخت ہوں دل تنگ
محرم یک نگاہ بیش نہیں
کیونکہ کہیے کہ تو نہیں آگاہ
کچھ چھپا تو نہیں رہا یہ راز
بس تغافل ہوا ترحم کر
کون کہتا ہے رہ نہ محوِ ناز
اُن بلاؤں پہ ان نے صبر کِیا
اس طرف کا نہ دیکھنا چھوڑا

اور یہ ماجرا ہوا مشہور
دیکھ کر اُس کو بیخور و بیخواب
مُنھ پر اُس کے جو رنگ خون نہیں
ہے نگہہ اُس کی جس طرف مائل
جب ہوا ذکر اقل واکثر میں
عشق بے پردہ جب فسانہ ہوا
گھر میں جا بہرِ دفعِ رسوائی
بیکسی بن نہیں ہے کوئی رفیق
گریہ آنسو سے پونچھتا ہے کبھو
اب تو وہ بھی کمی سی کرتی ہے
جی ہے اس سے اسیرِ آب و ِگل
صورت اک معنی نہاں ہوتی
ایک میں اور کتنے تصدیعات
شیشۂ دل نہیں ہے پارۂ سنگ
کم ہے سینے میں جا کہ ریش نہیں
اک قیامت بپا ہے یاں سرِ راہ
اک جہاں اس سے ہے غبر پرواز
گوشِ دل جانبِ تظلم کر
پر نہ اتنا کہ جی سے جائے نیاز
اختیار اپنے جی پہ جبر ِکیا
اس کے اندوہ سے نہ مُنھ موڑ
شور رسوائیوں کا پہونچا دور

جانا ہر اک نے عاشقِ بیتاب
عشق ہے اس کو یہ جنون نہیں
اُس طرف ہی گیا ہے اس کا دل
چاہ ثابت ہوئی اُسے گھر میں
مضطرب کد خدائے خانہ ہوا
بیٹھ کر مشورت یہ ٹھہرئی
یاں سے یہ غیرت مہہ تاباں
شب محافے میں اُس کو کر کے سوار
پار دریا کے جلد رخصت کی
گھر تکا اک آشنا کا مدِّ نِگاہ
ہووے جب اس بلا سے خاطر جمع
گھر سے باہر محافہ جو نکلا
طیش دل سے ہو کے یہ آگاہ
واں کے رہنے سے اُس کام نہ تھا
جس سے جی کو کمال ہو اُلفت
جنبش اُس کی پلک کو گرداں ہو
واں اگر موشکست کا ہو باب
واں اگر پاؤں میں لگے ہے خار
یار کو درد چشم اگر ہووے
چاک دامن ہیں واں پے زینت
واں دہن تنگ یاں ہے دل تنگی
دست افشاں وہ پائے کو باں یہ

قطرہ زن اشک سادہ راہ تمام
ہر قدم تھا زبان پر جاری
ہمسری اُس کی تھی میسّر کب
شوق مضطر نے بے تہی کی سخت
رفتہ رفتہ سخن ہوئے نالے
جا کے چندے کہیں رہے پنہاں
ساتھ دے ایک وایۂ غدّار
اس طرح فکر رفع تحعت کی
واں ہو روپوش تایہ غیرتِ ماہ
نور افزائے خانہ ہو جوں شمع
اس جواں ہی کے پاس ہو نکلا
ہو لیا ساتھ اُس کے بھر کر آہ
وہ گلی اس کا کچھ مقام نہ تھا
جس سے دل کی درست ہو نسبت
دل میں یاں کاوش نمایاں ہو
یاں رگ جاں کو ہووے پیچ و تاب
دل سے یاں سر نکالے ہے یکبار
چشم عاشق لہو میں تر ہووے
یاں گریباں ہے چاک گلی کی صفت
حسن اور عشق میں ہے یک رنگی
تھا محافے کے ساتھ گرم رہ
در پئے یار تھا یہ بے آرام

خواب ہے یا کہ ہے یہ بیداری
ہے مجھے بخت واژگوں سے عجب
نوشکیبی نے دل سے باندھا رخت
اُڑنے لگے جگر کے پر کالے
اضطرابِ دلی نے زور کِیا
دل کے غم کو زبان پر لایا
کالے جفا پیشۂ و تغافل کیش
مُنھ چھپایا ہے تونے اس پر بھی
صبر کس کس بلا سے کر گزروں
منزلِ وصل دور میں کم پا
ہے تو نزدیک دل سے اے طناز
ناز نے یک نفس نہ رخصت دی
تو تو واں زلف کو بنایا کی
تجھ کو تھی اپنے خال رُخ پہ نگاہ
تجھ کو مد نظر تھی اپنی چال
بستر خواب پر تجھے آرام
واں لگ لعل تیرے خنداں تھے
ناز و خوبی نے دل دیا نہ تجھے
اب تغافل نہ کر تلطف کر
گوشِ زودایہ کے ہوئے یہ سخن
پاس اُس کو بُلا تسلّی کی
کاے ستم دیدۂ غمِ دوری

زار نالی نہ کر شکیبا ہو
دل قوی رکھ نہ جی کو کاہش دے
سخت دل تنگ تھی یہ غیرت ماہ
ان نے بے اختیار شور کیا
آفتِ تازہ جان پر لایا
اک نظر سے زیاں نہیں کچھ بیش
نگہہ التفات ایدھر بھی
چارہ اس بن نہیں کہ مرگزروں
تجھ کو اس مرتبے میں استغنا
لیک تجھ تک سفر ہے دور دراز
آئینے نے تجھے نہ فرصت دی
جان یاں پیچ و تاب کھایا کی
دل مِرا مبتلائے داغِ سیاہ
میں سمکش ہوا کِیا پامال
مجھ کو خمیازہ کھینچنے سے کام
یاں فشروہ جگر پہ دنداں تھے
رحم سے آشنا کِیا نہ تُجھے
حال پر میرے ٹک تاسف کر
تھی وہ اُستاد کا رحیلۂ وفن
وعدۂ ول سے تشفی کی
ہو چکا اب زمانِ مہجوری
عِشق کا راز تا نہ رسوا ہو

چل کوئی دم کو داد خواہش دے
قطع تُجھ بِن نہ ہو سکی تھی راہ
گرچہ یہ حُسنِ اتفاق سے ہے
تیرے آنے سے دل کشادہ ہوا
بزمِ عشرت کریں گے باہم ساز
دے کر اُس کو فریب ساتھ لیا
لیک در پر وہ اُن نے یہ ٹھانی
یہ تو دل تفتۂ محبّت تھا
وقت نزدیک تھا جو آ پہونچا
آب کیسا کہ تجر تھا ذخسار
موج کا ہر کنا یہ طوفاں پر
ہمکنار بلا ہر اک گرداب
گزرِ موج جب نہ تب دیکھا
کشتی اک آن کر ہوئی موجود
کی کنارے پہ لا کے استادہ
اس سفینے میں جلد جا پہونچا
بیچ دریا میں دایہ نے جا کر
بھینکی پانی کی سطح پر اِک بار
حیف تیرے نگار کی پاپوش
غیرتِ عشق ہے تو لا اُس کو
اُس طرف آب کے اُترنا ہے
پانوں اُس کے جو ہیں نگار آلود

جس کفِ پا کو رنگ عمل ہو بار
اُس کی بھی جذب اشتیاق سے ہے
نشۂ دوستی زیادہ ہوا
ہو جواب اپنے دوست کا دمساز
دلِ عاشق کو اپنے ہاتھ لیا
کیجیے اس سے خصمی جانی
سخت وار فتۂ محبّت تھا
تا سرِ آب پا بپا پہونچا
تند و موّاج وتیرۂ و تہہ وار
مارے چشمک حباب عمّاں پر
لہجہ سرمایہ بخش تیرہ سحاب
ساحل اُس کا نہ خشک لب دیکھا
ہو فلک سے ہلال جیسے نمود
تھا محافہ رکوب آمادہ
یہ بھی واں ساتھ ہی لگا پہونچا
کفش اس گل کی اس کو دکھلا کر
اور بولی کہ اوجگر افگار
موجِ دریا سے ہووے ہم آغوش
چھوڑ مت یوں برہنہ پا اُس کو
اس نواحی کی سیر کرنا ہے
ظلم ہے ہوویں گر غبار آلود
منصفی ہے کہ خار سے ہو فگار

ان پہ نرمی میں گل سے ہوں جو پرے
یہ روا ہے تو اپنے حال پہ رو
جی اگر تھا عزیز اے ناکام
سُن کے یہ حرف دایۂ مکار
بے خبر کارِ عِشق کی تہہ سے
تھا سفینے میں یا کہ دریا میں
کھینچ گیا قعر کو یہ گوہرِ ناب
کہتے ہیں ڈوبتے اُچھلتے ہیں
ڈوبے جو یوں کہیں وہ جا نِکلے
عشق نے آہ کھو دیا اُس کو
جب کہ دریا میں ڈوب کر وہ جوان
دایۂ حیلہ گر ہوئی دل شاد
خار خار دلی سے فارغ ہو
یہ نہ سمجھی کہ عشق آفت ہے
خاک ہو کیوں نہ عاشق بیدل
وصل جیتے نہ ہو میسّر اگر
یاں سے عاشق اگر گئے ناشاد
قصّہ کوتاہ بعد یک ہفتہ
کہنے لاگی کہ اب تو اے وایہ
اب تو وہ ننگ در میاں سے گیا
تجھے جو ہنگامے اس کے حد سے زیاد
آبلہ چشم کو سیاہ کرے

مفت ناموسِ عشق کو مت کھو
کیوں عبث عشق کو کِیا بدنام
دل سے اُس کے گیا شکیب و قرار
جست کی اُن نے اپنی جاگہہ سے
موج زنجیر ہو گئی پا میں
تھی کشش عشق کی مگر تہہ آب
لیکن ایسے کوئی نکلتے ہیں
غرق دریائے عشق کیا نکلے
آخر آخر ڈبو دیا اُس کو
کھو گیا گوہرِ گرامی جان
واں سے کشتی چلی برنگِ باد
لے گئی پار اُس گلِ نو کو
فتنہ سازی میں اک قیامت ہے
کام سے اپنے یہ نہیں غافل
لادے معشوق کو یہ تربت پر
خاک خوباں بھی اُن نے دی برباد
آئی وہ رشک مہہ زخود رفتہ
ہو گیا غرق وہ فرد مایہ
آرزو مند اس جہاں سے گیا
ساتھ اُس کے گئے وے شور و فساد
شور فتنے تھے اس تلک سارے
دل تڑپتا ہے متصل میرا

وحشتِ طبع اب تو افزوں ہے
بے دماغی کمال ہوتی ہے
دل کوئی دم میں خون ہوویگا
بے کلی جی کو تاب دیتی ہے
جی میں آتا ہے ہوں بیابانی
مصلحت ہے کہ مجھ کو لے چل گھر
گاہ باشند کہ دل مِرا وا ہو
دایہ بولی کہ اے سراپا ناز
اب تو میں فتنے کو سُلایا ہے
کون مانع ہے گھر کے چلنے کا
ہو محافے ہیں دل خوشی سے سوار
دل سے اپنے پدر کے غم کم کر
کر ملاقات ہمدموں سے تو
یہ نہ سوچی کہ بد بلا ہے عِشق
جس کسو سے یہ پیار رکھتا ہے
جذب سے اپنے جب کرے ہے کام
صبح گاہاں وہ غیرتِ خورشید
پہونچی نصف النہار دریا پر
حد سے افزوں جو بیقرار ہوئی
اب تو بدنامیاں نہیں بارے
مرغ بسلم ہے یا کہ دل میرا
حال جی کا مِرے دگر گوں ہے

جان تن کے وہاں ہوتی ہے
آج کل میں جنون ہووے گا
طاقت دل جو اب دیتی ہے
پر کہوں ہوں کہ ہے یہ نادانی
یک دودم رہیں گے دریا پر
ورنہ کیا جانئے کہ پھر کیا ہو
حُسن کا در پہ تیرے روئے نیاز
اس بلا کے تیئں بٹھایا ہے
سدّ رہ کون ہے نکلنے کا
شاد شاداں کر آب سے تو گزار
مادرِ مہرباں کو خرّم کر
گرم بازی ہو محرموں سے تو
گھات میں اپنی لگ رہا ہے عشق
عاقبت اُس کو مار رکھتا ہے
عاشق مردہ سے بھی لے ہے کام
اس جگہ سے رواں ہوئی نومید
روئی بے اختیار دریا پر
دایہ کشتی میں لے سوار ہوئی
حرف زن یوں ہوئی کہ اے دایہ
موج سے تھا کدھر کو ہم آغوش
تجھ کو آیا نظر کہاں آ کر
مجھ کو دیجو نشان اُس جا کا

ہوں میں نا آشنائے سیرِ آب

لجہ کِیا لطمہ کس کو کہتے ہیں

ہیں میسّر کہاں یہ سیرِ عبور

مگر میں گرچہ دایہ تھی کامِل

یہ نہ سمجھی کہ ہے فریب عشق

پیچ دریا کے جا کہا یہ حرف

یاں وہ بیٹھا حباب کے مانند

سُنتے ہی یہ کہاں کہاں گر کر

موج ہر اک کمند شوق تھی آہ

دام گسترده عشق تھا تہہ آب

حسن موجوں میں یوں نظر آوے

تھیں وہ اُس کی حنائی انگشتاں

سر پہ جس دم کہ آب ہو کے بہا

کششِ عِشق آخر اُس مہہ کو

کودے خواص و آشناق سارے

کھینچ کر کوفت سب ہوئے بیتاب

جا ہم آخرش مردہ یار ہوئی

یاں گرا تھا کہاں وہ کم مایہ

تھا تلاطم سے کس طرف ہمدوش

پھر جو ڈوبا تو کس جگہ جا کر

میں بھی دیکھوں خروش دریا کا

ناشناسا لئے موجۂ دگر داب

گھر میں ہم نام سُنتے رہتے ہیں
اتفاقی ہیں اس طرح کے امور
لیک تجھ سے سخن کے تھی غافل
ہے یہ مہہ پارہ نا شکیبِ عشق
یاں ہوا تھا وہ ماجرائے شگرف
پھر نہ تھا کچھ سراب کے مانند
گر پڑی قصد ترک جاں کر کر
لپٹی اپس کو برنگ مارِ سیاہ
جس کے حلقے تمام تھے گرداب
نورِ مہتاب جیسے لہراوے
غیرت افزائے نخچۂ مرجاں
سطح پانی کا آئینہ سا رہا
لے گئی کھینچتی ہوئی تہہ کو
تابمقدور دست و پا مارے
نہ لگا ہاتھ وہ دُرِ نایاب
تہہ میں دریا کے ہمکنار ہوئی
پاک کی زندگی کی آرایئش
سر ٹپکتی جو گھر گئی دایہ
اب وعم مادر و برادر سب
دار و دستہ تمام اُس گل کا
سوئے دریا رواں ہوئے گریاں
خلق یکجا ہوئی کنارے پر

دام داروں سے سب نے کام لِیا
نکلے باہم وے موئے نکلے
ربط چسپاں بہم ہویدا تھا
ایک کا ہاتھ ایک کی بالین
جو نظر ان کو آن کرتے تھے
کیا لکھوں مل رہے وہ وصلی وار
کیوں نہ دشوار ہووے انکا فصل
حیرت کار عِشق سے مردم
ہو کے دست و بغل کی آسایئش
آفت اک لے گئی نئی دایہ
خاک افشاں بسر و نالہ بلب
ترک آئین کر تجمّل کا
آتشِ حم سے دل جگر بریاں
حشر برپا ہوئی کنارے پر
آخر اُن کو اسیرِ دام کِیا
دونوں دست و بغل ہوئے نکلے
مر گئے پر بھی شوق پیدا تھا
ایک کے لب سے ایک کو تسکین
ایک قالب گمان کرتے تھے
ہم دگر سے جدا ہوئے دشوار
جان دیدے ہوا ہو جن کا وصل
شکل تصویر آپ میں تھے گم

مقولۂ شاعر

میر اب شاعری کو کر موقوف
قدرت اپنی جہاں دکھاتا ہے
کتنی وسعت ترے بیاں میں ہے
عشق ہے ایک فتنۂ معروف
اس سے جو تو کہے سو آتا ہے
کتنی طاقت تری زباں میں ہے
لب پہ اب مُہرِ خامشی بہتر
یاں سخن کی فرامشی بہتر

مثنوی عشقیہ

چمن سے عنایت کے بادام وار
صفت عشق کی تا کروں میں بیاں
عجب عشق ہے مرد کار آمدہ
جہاں جنگ صف کی یہ ظالم لڑا
اگر لوگ مارے گئے سر بسر
کوء یکشتنی جو طرف ہو گیا
جہاں جس کسو سے اسے چاہ ہے
کسو سے اگر ہو گئی لاگ سی
ہوا ملفت یہ کسو سے کہیں
دفاق اس کا نکلا سرا سر نفاق
جواں کیسے کیسے موئے عشق میں

بہت عشق میں لوگ روگی ہوئے
گئے دشت میں کچھ نمد مو ہوئے
نہ مرغِ چمن ہی ہے تالان و زار
کسو کا جگر غم سے خوں ہو گیا
کوئی زار باراں بہت رو چکا
غرض عشق کا ہر طرف شور ہے
الٰہی زباں دے مجھے مغزدار
رہوں عشق کہنے سے میں ترزباں
جہاں دونوں اس کے ہیں بر ہمزدہ
صف اُلٹی جہاں ایک مارا پڑا
ولے فتح اس کی ہے یہ طرفہ تر
تہہ تیغ اس کے تلف ہو گیا
وہیں اُس کے تاقتل ہمراہ ہے
درد نے میں اس کے گلی آگ سی
تو نام و نشاں اس کا پھرواں نہیں
پڑا عاشقوں میں عجب اتفاق
بہت گھر خرابے ہوئے عشق میں
بہت خاک مل منھ پہ جوگی ہوئے
کچھ اک شہر میں پھر کے یکسو ہوئے
گئے داغ کہسار سے لالہ زار
گئے کوہ کمن کو جنون ہو گیا
کوء برق سا جل بجھا ہو چکا

مثنوی ''دریائے عشق'' کے چند اشعار کی تشریح

سبق ۸

تمہید:-

مثنوی ''دریائے عشق'' عشقیہ مثنوی ہے۔ عشق کی آگ، جسے میؔر سب سے بڑی حقیقت مانتے ہیں اور یہی آگ محبت کو دوام بخشتی ہے اور اسی کے وسیلے سے عاشق و معشوق اپنے عشق میں امر ہو جاتے ہیں۔ بُنیادی طور پر میؔر کو قصّے سے نہیں بل کہ اس مخصوص تصوّرِ عشق کو شعر کا جامہ پہنانے سے دلچسپی ہے۔ میؔر کی مثنویوں کے سارے کردار نظاہر ناکام عاشق ہیں لیکن جذبِ عشق کے اظہار میں یکتائے روزگار ہیں۔ میؔر کا عاشق بھی انہی عاشقوں میں سے ایک ہے جس کی منزل اور مقصدِ حیات عشق ہے۔ میؔر کی عشقیہ مثنویوں میں یہ تصوّرِ عشق مادی و روحانی اور مجازی و حقیقی سطح پر مل کر ایک وحدت بن گیا ہے۔ ان کی مثنویوں کے کردار شہزادے، شہزادیاں نہیں ہیں بل کہ عام انسان ہیں۔ جو متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثنوی دریائے عشق میں بھی میؔر نے جن کرداروں کو پیش کیا ہے وہ بھی متوست طبقے کے افراد ہیں جو عشق کے حضور میں اپنی جان ایسے نچھاور کر دیتے ہیں جیسے وہ اس کے لئے پہلے سے تیار ہوں اور یہ مثنوی اس کی عمدہ مثال ہے۔

تشریح :

1۔ ایک جگہ نہایت ہی خوبصورت نوجوان رہتا تھا۔ جس کے رُخسار گلابی ارقد سرو کی مانند تھا۔

2۔ عشق کا جذبہ اُس کے دل اور رگ وپے میں ہر وقت سرگرم رہتا تھا اور دل اُس کا موم کی طرح ملائم اور نرم تھا۔

3۔ خوبصورت اور حسین چہروں سے اُسے ہمیشہ دلچسپی، رغبت اور محبت رہتی تھی۔

4۔ یہ عاشق خود بھی خوبصورت تھا اور خوبصورت لوگوں کے بغیر رہ بھی نہیں سکتا تھا۔

5۔ اگر کبھی کسی حسین چہرے کے لئے کوئی ترکیب نظر آتی تھی تو دل کی حال بے حال ہو جاتی۔

6۔ اگر کبھی کسی خوبصورت چہرے کی طرف نظر جاتی تو پھر دن دن اسی کا ذہن و دل رنجیدہ اور غمگین رہتا۔

7۔ اگر کسی حسین چہرے پر زلف پریشان ہوتی تو اُس کا خیال تہ و بالا ہو جاتا تھا۔ جب کسی حسین چہرے پر زُلف کی لٹ آویزاں ہوتی ہے تو وہ چہرہ زیادہ خوبصورت دکھائی دیتا ہے۔ جب یہ نوجوان کسی چہرے پر یہ نظارہ دیکھتا تو اُسے خود کی خبر نہیں رہتی تھی۔

8۔ اگر کہیں اُسے سُرمگیں آنکھیں نظر آتی تھیں تو اُس کا دل بے اختیار آہ و فریاد شروع کرتا تھا۔ سیاہ آنکھوں سے مُراد ایسی آنکھیں جن میں سُرمہ (کاجل) لگا ہو۔

9۔ اُس کے ذہن میں عشق کا جنون اور دل میں جذبۂ محبت تھا گویا اُس کا سراپا عشق سے لبریز تھا۔ عشق اُس کے رگ و پے میں سمایا ہوا تھا۔

10۔ وہ خوبصورت نوجوان گویا ہر وقت پنا محبوب کے بے صبر رہتا تھا۔ معشوق کے نہ ہونے کی وجہ سے وہ ہر وقت بے قرار رہتا تھا۔

11۔ ایک دن بے قراری سے گھرا کر وہ باغ کی سیر کی طرف نکلا۔

12۔ باغ میں کبھی کسی گُل کے پاس ٹھہرتا اور کبھی کسی ہریالی جگہ پر رُک جاتا تھا۔

13۔ باغ کے درمیانی حصّے والے راستے سے جہاں چاروں طرف پھولوں کی کیاری لگی ہوتی تھی یہ نوجوان سایہ دار درختوں کے نیچے سے آگے آگے بڑھتا جاتا۔

14۔ نہ دل میں تسلی تھی اور نہ آنکھوں میں آنسوٗ تھمتے تھے۔ بے قرار دل ہونے کی وجہ سے آنسو اس قدر جاری تھے کہ اب یہ آنسو نہیں بل کہ خالص خون نظر آ رہا تھا۔

15۔ دل کی بے قراری سے نا اُمید ہو کر ہر درخت ے نیچے بیٹھ کر بہت روتا تھا۔

16۔ پھولوں کے اس باغ کو نا اُمیدی سے دیکھ کر آخر اس نے اپنا رُخ ایک مکان کی طرف کیا۔

17۔ دل میں بے قراری واُداسی کا اُسے سخت غم تھا۔اور جب راستے چلتا تو اپس کے خیال بکھرے ہوئے ہوتے تھے۔یعنی کہ ذہن ودل اُس نو جوان کا مکمّل طور پر منتشر تھا۔

18۔ اچانک وہ ایک ایسے کوچے کی طرف چل نکلا جہاں وہ نئی آفت سے دوچار ہوا۔

19۔ ایک دریچے سے ایک حسین لڑکی (چاند سا چہرہ رکھنے والی) اس نو جوان کی طرف مسلسل دیکھ رہی تھی۔

20۔ جب اُس حسینہ پر اس کی ایک نظر پڑ گئی تو پھر وہ نظر واپس نہ آئی یعنی وہ مسلسل اُسے دیکھتا رہا۔

21۔ یہ نظر تھی یا کوئی آفتِ جاں تھی جس سے جسم کی پوری طاقت رُخصت ہوگئی۔

22۔ حسینہ کی طرف دیکھتے دیکھتے نو جوان کے ہوش وحواس بھی جاتے رہے اور آہ کرتے ہوئے صبر بھی رخصت ہوتا رہا۔

23۔ عِشق کی بے قراری نے نو جوان کے ساتھ بے وفائی کی اور طاقت نے بھی بھر پور ساتھ نہیں دیا۔

24۔ جب نو جوان نے حسینہ کے چہرے سے نظریں ہٹائیں تو وہ بے قرار ہو کر خاک پہ گر پڑا

25۔ حسینہ کو تو اس کی حالت کا کوئی اثر نہ ہوا لیکن یہاں نو جوان کی حالت بہت زیادہ خراب ہو رہی تھی۔

26۔ دریچے میں بیٹھی ہوئی حسینہ اپنے دامن کو جھاڑتے ہوئے وہاں سامنے سے اُٹھ جاتی ہے۔

27۔ جب حسینہ وہاں سے اُٹھ کے چلی گئی تو نو جوان کی خوبصورتی خاک میں مل گئی۔

28۔ دل کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی اور چہرے کا رنگ بھی اُڑ گیا۔

29۔ اپنے ہاتھوں سے گریباں کو چاک کرنے لگا جس سے پورا دامن پیروں تک پھیل گیا۔

30۔ نو جوان کی حالت اس قدر خراب ہوئی کہ طبعیت نے جنون کی شکل اختیار کی اور آنسوؤں نے خون کا رنگ اختیار کیا۔

31۔ عِشق کی آگ دل میں پیدا ہوگئی اور اس آگ نے جگر کو بھی داغ لگا دیا۔

32۔ زمین پر وہ ایسے لیٹا ہوا تھا جیسے بستر پر تھا۔اس کی حالت اس قدر رخستہ ہوگئی کہ اب دلِ عشق کا بیمار بن گیا۔

33۔ زمین پر لیٹے لگانے کی وجہ سے اُس کے جسم پر کانٹے چبھے جن سے پورا جسم زخمی ہو گیا۔جسم پر خون کے چھینٹے پڑنے سے نقش ونگار بن گئے۔

34۔ اس حالت میں جب حسینہ کے چہرے کی طرف نظر پڑی تو نا اُمیدی سے ایک آہ نکل گئی۔

35۔ اسی مایوسی کی غمگین فریاد اور عشق کے جذبے کی گرم آہ سے نوجوان کا حسینہ کے ساتھ دُور سے رابطہ ہوا۔

36۔ ہونٹ سوکھنے کے بعد وہاں خالص خون نظر آنے لگا۔نوجوان کی حالت اس قدر زریہ ہوئی کہ کھانا پینا، آرام و سکون سب رخصت ہوگیا۔ ہر وقت بے قرار رہنے لگا۔

37۔ اس کی حالت دیکھنے کو سبھی مخلوق آئی لیکن مجال کہ حسینہ کو کوئی اثر ہو جس سے وہ اسے دیکھنے آتی۔

38۔ اگر کسی نے شفقت یا ہمدردی سے کچھ کہا تو سوائے رونے کے وہ کچھ نہیں کرتا تھا۔

39۔ اُس نوجوان نے آخر حسینہ کے در پر بیٹھ کر جان دینے کا اِرادہ کرلیا۔

40۔ دل کو سمجھانے کے باوجود بھی بے قرار رہنے لگا اور اُس کے در پر جانے سے نہیں رُکا۔اسی شوق نے عاشق کے کام کو خراب کردیا۔کیونکہ در پر بیٹھنا اس کے لئے اچھا نہیں تھا۔

41۔ کچھ لوگ اُسے دیوانہ اور مجنوں سمجھ کر ہمدردی کرتے تھے۔

42۔ آخر لوگوں پر یہ راز کھُلا کہ یہ نوجوان کسی کا عاشق ہے جو یہاں در پر آ بیٹھا ہے۔یہ لوگوں کو سخت ناگوار گُزرا۔

43۔ لڑکی کے خاندان سے وہاں کے لوگوں کے مراسم اچھے تھے کیوں کہ ایک ساتھ مل جُل کر رہتے تھے اس لئے نوجوان کا وہاں بیٹھنا اُنھیں باعثِ شرم محسوس ہوا۔

44۔ لڑکی کے اہلِ خانہ بھی نوجوان پر سخت ناراض ہوگئے اور اُس کی جان کے دُشمن بن گئے۔

45۔ سبھی نے مل کر باہم مشورہ کرلیا کہ اس بلا (نوجوان) کو یہاں سے بھگانے کا ایک ہی راستہ ہے کہ اس کو جان سے مارڈالنا چاہیئے۔

46۔ لیکن سوچنے لگے کہ اگر جان سے مار ڈالا تو ہر خاص و عام یہ جاننے کی کوشش کرے گا کہ آخر کیوں مارا گیا؟

47۔ سبھی پوچھتے رہیں گے کہ اس نوجوان نے کون سا گُناہ کیا تھا جس کی پاداش میں اسے مارا گیا۔ کس نے مارا اور آخر کہاں مارا گیا۔

48۔ جب یہ نوجوان دیوانگی کے اس عالم سے بیدار ہوگا تو اس کو بہت سی لعنت ملامت کرنی چاہیئے۔

49۔ ایک اور طریقہ سے اس کو تنگ کِیا جا سکتا ہے تا کہ ہم پر کوئی الزام نہ آئے یا جس سے ہمیں شرم نہ ہو۔

50۔ اُس کی دیوانگی کی تہمت اُس کے سر رہنے دیجیے اور اُسے سنگسار کرنا بہتر ہے تا کہ وہ یہاں سے بھاگ جائے۔

۱.۷ مشق کے لئے معلومات کی جانچ

۱.۷.۱ مثنوی دریائے عشق میں سے کوئی پانچ اشعار کی تشریح کیجیے۔

۱.۷.۲ درج ذیل اشعار کو مکمّل کیجیے:-

زُلف ہوتی گر کسو کی برہم ....

کسو چہرے کا رنگ زرد ہوا ....

ہر قدم تھا زباں پہ جاری ....

مثنوی ''دریائے عشق'' کا خلاصہ

سبق ۹

''دریائے عشق'' میؔر کی ایک نمائندہ عشقیہ مثنوی ہے اس میں میؔر نے ابتدا میں تصوّرِ عشق پر روشنی ڈالی ہے۔ اشعار کو پڑھ کر یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ یہ ساری کائنات، دُنیا کا سارا نظام عشق کے محور پر گھوم رہا ہے۔ مثنوی کا ہیرو ایک عاشق مزاج لالہ رُخسار جوان ہے جو خوش صورتوں سے اُنس رکھتا تھا اور اس وقت کسی محبوب کے نہ ہونے کی وجہ سے بےصبر و بےقرار تھا۔ ایک دن وہ باغ کی سیر کو گیا تو اچانک اس کی نظر ایک حسین دوشیزہ پر پڑی جو باغ کا نظارہ کر رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی اس کا صبر رُخصت ہوا اور جب وہ چلی گئی تو وہ اس کے عشق میں مبتلا ہو گیا اور پھر دُنیا کو چھوڑ کر محبوب کے در پر مرنے کے ارادے سے آ بیٹھا۔ کچھ ہی دن بعد اس کے عشق کا چرچا عام ہونے لگا۔ بدنامی کے ڈر سے لڑکی والوں نے اُس نوجوان کو مار ڈالنے کا منصوبہ بنایا لیکن یہ سوچ کر کہ اس سے تو اور بدنامی ہوگی۔ کوئی تلوار لے کر اس کے سر پر آ گیا لیکن وہ ہر چیز سے بے نیاز خیالِ محبوب میں محو تھا اور درِ یار سے نہ ٹلا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ماجرا مشہور ہو گیا اور رسوائیوں کا شور دُور دُور تک پہنچ گیا۔ لڑکی کے گھر والوں نے طے کیا کہ لڑکی کو دایہ کے ساتھ دریا پار عزیزوں کے ہاں بھیج دیا جائے اور جب یہ بلا ٹل جائے تو اسے واپس بلا لیا جائے۔ جب لڑکی محافے میں بیٹھ کر گھر سے چلی تو یہ عاشقِ زار بھی ساتھ ہو لیا اور آہ و زاری کے ساتھ اپنے جذبات کا اظہار کرنے لگا۔ دایہ نے جب یہ باتیں سنیں تو اس نے نوجوان کو اپنے پاس بلایا۔ اسے تسلّی دی اور کہا کہ اب ہجر کا زمانہ ختم ہو گیا ہے۔ لڑکی بھی تیرے بغیر نہیں رہ سکتی اس کا یہ راستہ کتنا مشکل ہے۔ باتیں کرتے کرتے جب کشتی دریا کے بیچ پہنچی تو دایہ نے لڑکی کی جوتی دریا میں پھینک دی اور کہا کہ کیسے افسوس کی بات ہے کہ تیرے محبوب کی جوتی موجِ دریا سے ہم آغوش ہوا اور تو اسے واپس نہ لائے۔ دایہ کی یہ بات سُن کر نوجوان دریا میں کود گیا اور ڈوب گیا۔ دایہ لڑکی کو دریا پار لے گئی۔ ایک ہفتے بعد لڑکی نے کہا کہ اب تو وہ ڈوب چُکا ہے۔ سارے ہنگامے اور فساد ختم ہو گئے ہیں، ہمیں واپس چلنا چاہئے۔ دایہ اور لڑکی کشتی میں سوار ہو کر واپس ہوئے تو لڑکی نے کہا ''جب وہ جگہ آئے جہاں وہ نوجوان ڈوبا تھا تو مجھے بتانا تا کہ میں بھی دیکھوں'' جب کشتی بیچ دریا کے پہنچی تو دایہ نے کہا کہ وہ ماجرا یہاں ہوا تھا۔ یہ سُنتے ہی ''کہاں کہاں'' کہہ کر دایا میں گر گئی اور ڈوب گئی۔

تیراکوں نے تلاش کیا مگر پتہ نہ چلا۔ گھر والوں نے جال ڈلوائے تو دیکھا کہ وہ نوجوان اورمہ پارہ مُردہ حالت میں ایک دوسرے سے پیوست جال میں آ گئے۔ ایک کا ہاتھ ایک کی بالیں پر ہیں اورلب ایک دوسرے سے پیوست ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ دونوں ایک قالب ہیں۔ انھیں الگ کرنے کی کوشش کی گئی مگر بے سود۔ وہ تو ایک دوسرے میں گُم ہو چکے تھے۔ مثنوی اسی المیہ وصل پر ختم ہو جاتی ہے۔

میر تقی میرؔ کی غزل گوئی

سبق ۱۰

جس طرح غزل کو اُردو شاعری کی آبرو کہا جاتا ہے، اسی طرح اگر میر تقی میرؔ کو اُردو غزل کی آبرو کہا جائے تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا۔ یہ وہ میرؔ ہیں جن کو کبھی ''شہنشاہِ غزل'' کہا گیا تو کبھی ''خدائے سخن''۔ اُنہیں کبھی ''سرتاجِ شعراء اُردو'' کے خطاب سے نوازا گیا تو کبھی ''شاعرِ بے دماغ'' سے موسوم کیا گیا۔ اُردو غزل کے اس بے تاج بادشاہ کو یہ خطاب والقاب کسی نواب یا بادشاہ کے دیے ہوئے نہیں ہیں بلکہ شاعرانہ جلال کا یہ اعجاز میرؔ نے خود اپنی ہستی کو مٹا کر حاصل کیا ہے۔

میرؔ کو زندگی نے کچھ یوں ستایا کہ وہ کبھی نوابوں کے محلوں کی زینت بنے اور کبھی راجاؤں اور بادشاہوں کی حویلیوں کی رونق۔ زندگی میں کئی موقعے ایسے بھی آئے کہ ایک ایک کر کے اپنوں اور بیگانوں سبھی کے دروازے پر دستک دی۔ مگر یہ وہ زمانہ تھا جب کوئی کسی کے کام نہ آ سکتا تھا، میرؔ کو ہر طرف سے مایوسی ملی۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ جو دردو غم میرؔ کی زندگی میں موجود تھا اسی غم کو اپنے اشعار کی زینت بنا کر لوگوں کو جگ بیتی سے آپ بیتی محسوس کرنے پر مجبور کر دیا۔ غالبؔ وذوقؔ سے لے کر حالیؔ اور فانی تک ہر بڑے سے بڑے شاعر نے میرؔ کی شاعری کا لوہا مانا ہے۔ غالبؔ جیسا عظیم وخوددار شاعر بھی یہ کہنے پر مجبور ہو گیا:

ریختہ کے ایک تمہیں استاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

اسی طرح ''ملک الشعراء'' ذوقؔ نے بھی میرؔ کی عظمت کا اعتراف یوں کیا ہے:

نہ ہوا پر نہ ہوا ، میرؔ کا انداز نصیب
ذوقؔ یاروں نے بہت زورغزل میں مارا

خواجہ الطاف حسین حالؔی نے ''مقدمہ شعروشاعری'' میں چاک وگریباں کی جو تفصیل بیان کی ہے، انہوں نے سب سے بہترین شعر میرؔ کے اس شعر کو قرار دیا ہے:

اب کہ جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

اُن کی شاعری عشق کی چوٹ کھوئے ہوئے دلی تجربات کا نام ہے۔ میرؔ کے نزدیک عشق ایک ایسی آگ کی مانند ہے جو اُن کی ہڈیوں کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم
اب جو کہ ہیں خاک انتہا ہے یہ

میرؔ کے عشق نے اُردو شاعری کو درد و تاثیر اور سوز و گداز سے مالا مال کر دیا۔ میرؔ کی عشقیہ شاعری میں ان کی محرومیوں اور ناکامیوں کا عکس صاف دکھائی دیتا ہے۔ میرؔ اپنی محرومیوں اور ناکامیوں کو تقاضۂ عشق قرار دیتے ہیں۔ میرؔ پر عشق نے ایسا قہر توڑا کہ آفتابِ غم سے پھوٹنے والی کرنوں کا المیہ رقص اُن کی شاعری میں بکھرنے لگا اور اُن کی حسرتوں و آرزوؤں کا خون اُن کی غزلوں میں رواں ہو گیا:

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا
لہو آتا ہے ، جب نہیں آتا

میرؔ کی محرومی و ناکامی اُن کی غم زندگی کی بنیادی حقیقت ہے۔لیکن میرؔ نے اپنے غم کو آفاقی غم بنا کر پیش کیا ہے جس سے کلامِ میر کا دائرۂ اثر بہت وسیع ہو جاتا ہے۔ میرؔ کے غم کی دوسری خوبی یہ ہے کہ وہ ہمارا حوصلہ بڑھاتا رہتا ہے اور حالات سے مقابلہ کرنے کی طاقت عطا کرتا ہے۔ میرؔ ناکام ہوتے ہیں لیکن کبھی ہمت نہیں ہارتے۔ زندگی بسر کرنے کا حوصلہ اور غموں میں مسکرانے کا جو پُر وقار انداز میرؔ کے یہاں ملتا ہے اُس کی کوئی دوسری مثال ملنا مشکل ہے۔

میرے سلیقے سے نبھی میری محبت میں
تمام عمر نا کامیوں سے کام لیا

میؔر انتہائی غم کے باوجود گھبراتے نہیں بلکہ وہ بڑی سنجیدگی اور خودداری کے ساتھ غموں سے لڑنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔اس سلسلے میں سید عبداللہ لکھتے ہیں:

''میؔر اپنے شعروں میں غم کا اظہار تو جا بجا کرتے ہیں، مگر اس لئے کہ ہم اس کے تلے دب نہ جائیں۔وہ برابر ہمیں سہارا دیتے ہیں۔غم کے پہلو بہ پہلو وہ کسی نہ کسی خوشی کا ذکر بھی کرتے جاتے ہیں، جس سے غم کی شدت کم ہو جاتی ہے۔''

میؔر کبھی کبھار اخلاقانہ اور حکمانہ مضامین کو اپنے رنگ میں اس سادگی اور صفائی سے ادا کرتے ہیں کہ جس پر ہزاروں بلند پروازیاں اور نازک خیالیاں قربان کرنے کو جی چاہتا ہے:

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

چشم ہو تو آئینہ خانہ ہے دہر
منہ نظر آتے ہیں دیواروں کے بیچ

کلامِ میر میں عشقِ حقیقی کے جلوے بھی نظر آتے ہیں۔میؔر کے یہاں بے ثباتی، انسان کی عظمت اور بے خودی جیسے موضوعات کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔میؔر فلسفۂ وحدت الوجود کے قائل ہیں اور انہیں دنیا میں ہر طرف خدا کے ہی جلوے نظر آتے ہیں:

عشق ہی عشق ہے جدھر دیکھو
سارے عالم میں پھر رہا ہے عشق

میؔر کا زمانہ غم کا زمانہ تھا۔اگر وہ غم کے شاعر نہ ہوتے تو وہ اپنے زمانے کے ساتھ دغا کرتے اور شاید ہمارے لئے بھی اتنے بڑے شاعر نہ ہوتے۔دراصل میؔر کو دل اور دلی دونوں کے اُجڑنے کا غم تھا اور اس افسوس ناک صورتِ

حالی نے میرؔ کی شاعری کو وہ رنگ و آہنگ دیا جسے آٹھارویں صدی کی ''روح'' کہا جا سکتا ہے۔ وہ اپنی شاعری میں اپنے زمانے کی روح کو یوں سمیٹتے ہیں:

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

میرؔ الفاظ کے جادوگر ہیں۔ انہوں نے روزمرہ کی زبان، محاوروں اور ضرب الامثال کو اس سادگی، صفائی اور روانی کے ساتھ غزل کا حصہ بنایا کہ ان کی شاعری میں فارسی رچاؤ اور رنگ و آہنگ پوری طرح نمایاں ہو گیا۔ ان کے یہاں موسیقی و ترنم، رمز و کنایہ اور تشبیہات و استعارات کی ایک خاص رنگارنگی پیدا ہو گئی ہے:

نازکی اُس کے لب کی کیا کہئے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

اندازِ میرؔ کے حوالے سے پروفیسر نورالحسن نقوی نے لکھا ہے:

> ''میرؔ شعر نہیں کہتے باتیں کرتے ہیں۔ وہ باتیں، جو سُننے والے کو ایسی لگیں جیسے پہلے سے اس کے دل میں موجود ہیں۔ انداز ایسا جیسے بے تکلف دوست اپنے دوست سے راز و نیاز میں محو ہو۔ لہجہ سرگوشی کا، زبان عام بول چال کی۔''

عام طور پر میر کی شاعری پر لکھتے ہوئے نقادوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ میر کی شاعری ان کی ذاتی دکھ درد اور ان کے عہد کے حالات کی ترجمانی کرتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ میر کی شاعری کے بارے میں یہ مروجہ خیالات میر کی شاعرانہ عظمت پر دلالت نہیں کرتے۔ میر ایک منفرد اور بڑے شاعر ہیں۔ ان کی عظمت اور انفرادیت کا اعتراف نہ صرف تذکرہ نگاروں نے کیا ہے بلکہ معاصر نقادوں میں مولوی عبدالحق، سید احتشام حسین، آل احمد سرور، اثر لکھنوی، فراق گورکھپوری، حسن عسکری، نظیر صدیقی، شبیہہ الحسن، گوپی چند نارنگ، شمس الرحمان فاروقی اور حامدی کاشمیری نے بھی

کیا ہے۔مولوی عبدالحق نے میر کی شاعرانہ عظمت کی نشان دہی کرتے ہوئے لکھا ہے:

''میر کے کلام میں ایسے حیرت انگیز جلوے اکثر نظر آتے ہیں، جس طرح بعض اوقات سمندر کی سطح دیکھنے میں معمولی اور بے شور وشر نظر آتی ہے لیکن اس کے نیچے ہزاروں لہریں موجزن ہوتی اور ایک کھلبلی مچائے رکھتی ہیں، اسی طرح اگر چہ میرؔ کے اشعار کے الفاظ ملائم، دھیمے، سلیس اور سادہ ہوتے ہیں لیکن ان کی تہہ میں غضب کا جوش یا درد چھپا ہوتا ہے''

(انتخابِ کلام میر)

مولوی عبدالحق نے میرؔ کے کلام میں ''حیرت انگیز جلوے'' کا ذکر کر کے تاثراتی انداز میں سہی، میر شناسی میں ایک پتے کی بات کہی ہے۔جدید تنقیدی اصولوں کی روشنی میں دیکھا جائے تو میر کی شاعری کے حیرت انگیز جلوؤں ،کا ذکران کے اشعا میں کثیر المغویت کی طرف اشارہ کرتا ہے خود میر اپنی شاعری کی اس خصوصیت سے آگاہ تھے، کہتے ہیں:

صد رنگ میری موج ہے میں طبعِ رواں ہوں

میر کی غزلوں میں ابھرنے والی شعری دنیا میں نمایاں واقعات کی نشان دہی کی جائے تو اس دنیا میں ایک عشق پیشہ کردار ابھرتا ہے جو میر کی حقیقی زندگی میں عشق کی ناکامی کی یاد دلاتی ہے۔حقیقی زندگی میں انہوں نے ایک پری تمثال لڑکی سے در پردہ عشق کیا تھا یانہیں، جدید تحقیق نے اس کے بارے میں شکوک کو جنم دیا ہے۔تاہم ان کی شاعری میں جذبۂ عشق کا خوب اظہار ملتا ہے۔ان کے جذبۂ عشق کے کئی پہلو ہیں۔وہ اس جذبے سے اپنے وجود کو گداز کر چکے تھے۔عشق نے ان کے تن بدن میں وہ آگ لگائی ہے کہ ان کے استخواں کانپ کانپ جلتے ہیں۔

استخواں کانپ کانپ جلتے ہیں
عشق نے آگ یہ لگائی ہے

ان کے عشقیہ اشعار میں حسن نسوانی دلکشیوں، محبوب کے بدن کی خواہش، کیف وصال اور کرب انتظار کی

کیفیات ملتی ہیں۔انھوں نے دل کے جانے کا ذکر کیا ہے اور اسے ''عجب سانحہ'' قرار دیا ہے۔

مصائب اور تھے پر دل کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

ان کے یہاں عشق زندگی کا ایک اہم اور سنجیدہ تجربہ ہے۔ وہ اسے جنسی ابتذال کی پست سطح سے اٹھاتے ہیں اور روحانی رفعت اور فکری تب وتاب میں بدل دیتے ہیں۔ جذبۂ عشق ان میں خارجی دنیا سے برگشتگی اور داخلیت پسندی کے رجحان کو تقویت دیتا ہے۔عشق دنیا کی ساری زبانوں کی شاعری میں ایک بنیادی تجربے کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کی مختلف صورتیں ابھرتی رہی ہیں۔ حافظ، اور اقبال کے یہاں عشق علامتی اہمیت رکھتا ہے۔عشق ان کے یہاں داخلیت ،خودآگہی، عرفان، تلاش اور جوش حیات کی علامت بن جاتا ہے۔ اردو اور فارسی میں ایسے عشقیہ اشعار بھی ملتے ہیں جو روایت اور تقلید کا پتہ دیتے ہیں۔ ولی کے بعد مظہر جان جاناں اور سودا، درد اور میر سوز کے یہاں عشق کے روایتی موضوعات کی کمی نہیں۔خود میر کے دواوین میں بھی روایت غالب رہی ہے۔تاہم میر کے چیدہ چیدہ اشعار میں عشقیہ تجربات کی تازگی اور سچائی کا پتہ ملتا ہے۔

ان کے یہاں عورت کا جو کردار ابھرتا ہے، وہ غیر انسانی نہیں۔ وہ خوب صورت عورت کی زندہ، شوخ اور طرح دار شخصیت ہے۔اس سے میر کے یہاں حسیات کی بیداری کا پتہ چلتا ہے۔حسیات کی تشفی جمالیاتی کیفیت کو جگاتی ہے۔

بال کھلے وہ شب کو شاید بسترِ ناز پر سوتا تھا
آئی نسیم جو صبح سے ایدھر پھیلا عنبر سارا ہے

....

کھلنا کم کم کلی نے سکھا ہے
اس کی آنکھوں کی نیم خوابی ہے
نازکی اس کے لب کی کیا کہئے

پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

....

ساعد سیمیں دونوں اس کے ہاتھ میں لاکر
چھوڑ دئے
بھولے اس کے قول وقسم پر ہائے خیال خام کیا

اس نوع کے عشقیہ اشعار میر کے جمالیاتی احساس کی نزاکت اور پاکیز گی کو ظاہر کرتے ہیں لیکن وہ اسی پر اکتفانہیں کرتے بلکہ زندگی کی بھیانک حقیقت کا اشاریہ بھی بن جاتے ہیں۔محبوبہ عاشق کے دل پر مکمل تصرف پاتی ہےمگر خود نا قابل تسخیر رہتی ہےاور عاشق کو کرب، وحشت اور بے کسی سے آشنا کرتی ہے۔یہ اشعار دیکھئے ان میں محبوبہ ایک ساحرہ ہے جو عاشق کی مبہوت کرتی ہے:۔

مبہوت ہوگیا ہے جہاں اک نظر کئے
جاتی نہیں ان آنکھوں کی جادوگری ہنوز

اس محبوب کی گلی میں عاشق کا جانا اس کی موت کا سبب بن جاتا ہے:۔

کیا بندھا ہے اس کے کوچے کا طلسم
پھر نہ آیا جو کوئی اودھر گیا

میر کی شاعری میں متصوفانہ خیالات وتجربات کا بھی نمایاں طور پر اظہار ملتا ہے۔تصوف نے انہیں خالق ومخلوق کے رشتوں کا احساس دلایا۔انہیں بچپن ہی سے صوفیانہ ماحول ملا تھا۔ان کے والد اور منھ بولے چچا دونوں ان کو دینوی خواہشات سے کنارہ کش ہوکر اپنے من میں ڈوبنے کی تعلیم دیتے رہے، چنانچہ خود آگہی ،قناعت اور استغراق ان کی طبیعت کا خاصہ بن گئے۔وہ بعض فکری میلانات کا اظہار کرنے لگے اور زندگی،موت اور کائنات کے مسائل پر غور وفکر کرتے رہے۔

میؔر کے یہاں عشق بنیادی رویہ ہے، جس کے پیرائے میں حیات وکائنات کے تمام مسائل پنہاں ہیں

۔حسرت ویاس، محرومی وتنہائی، رنج والم اور بدنصیبی کے سیاہ بادل ہمیشہ میؔر کی زندگی پر چھائے رہے۔یہی وجہ ہے کہ میؔر کے بعض اشعار''نشتر'' کہلائے اوران کی شاعری دل اوردلی کا''مرثیہ'' بن گئی۔بقول مولوی عبدالحق:

''میؔر کے شعر چپکے چپکے خود بخود دل میں اثر کرتے چلے جاتے ہیں،جس کی مثال اس نشتر کی سی ہے،جس کی دھار نہایت باریک اور تیز ہے۔''

مولوی عبدالحق نے لکھا ہے:۔

''میر نے حیرت انگیز اور زہرہ گداز واقعات اور انقلابات کو دیکھا اور برتا''

(مقدمہ انتخاب کلامِ میر)

مجنوں گورکھپوری نے لکھا ہے:۔

''میر کی شاعری کو پڑھنے اور سمجھنے کے لئے بہت ضروری کے کہ ان کہ زمانے کے معاشرتی ماحول اوران اسباب وحالات پر جن کے اندر رہ کر میر کی شخصیت کی تعمیر ہوئی، دقیق نگاہ ڈالی جائے''

(میر اور ہم)

خواجہ احمد فاروقی کا خیال ہے کہ:

''میر کی زندگی اور شاعری کو اس سیاسی،معاشرتی اور انفسیاتی پس منظر میں دیکھنا چاہئے''

(میر: حیات اور شاعری)

میرؔ کی مثنوی نگاری

سبق ۱۱

میر تقی میرؔ کو ایک غزل نگار کی حیثیت سے بلند مرتبہ حاصل ہے لیکن انہوں نے غزل کے سوا دوسری اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ میرؔ نے قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، واسوخت، شہر آشوب، سب کچھ لکھا ہے۔ مگر غزل کی قبولیت عامہ کے سامنے دوسری اصناف کو ناقدوں کی توجہ نصیب نہیں ہو سکی۔

اردو کی قدیم شاعری میں ''مثنوی'' بھی ایک مقبول صنف رہی ہے، غزل تو علامتی شاعری کا وسیلہ تھی، اور مثنوی کو بیانیہ شاعری یا مسلسل اور مربوط داستان کی ترسیل کا ذریعہ بنایا گیا تھا۔ فارسی میں مثنوی کو اتنا فروغ ہو چکا تھا کہ اردو کے مثنوی نگار شاعروں کو اس صنف میں زیادہ اجتہاد کا عمل نہیں کرنا پڑا۔ اس کی بحریں مقرر تھیں اور ہر بحر میں اعلیٰ درجہ کی مثنویاں پہلے ہی لکھی جا چکی تھیں۔ اس لئے قدیم شعرا نے یا تو کسی فارسی قصے ہی کو اردو کا لباس پہنا دیا، یا کوئی مذہبی داستان نظم کر دی، اور بہت کم ایسا ہوا کہ انہوں نے قصہ بھی خود ہی تصنیف کیا ہو، ہاں ہندوستانی لوک روایتوں کو ضرور نظم کیا ہے میرؔ کے کہد تک اردو میں مثنوی کو زیادہ چلن نصیب نہیں ہوا تھا۔ اگر چہ دکنی میں کچھ قصے نظم ہوئے تھے جنہیں ہم اردو کی قدیم مثنویاں کہہ سکتے ہیں۔ یا مثلاً شمالی ہندوستان کے ایک شاعر سید اسماعیل امروہوی نے کچھ مثنویاں لکھی تھیں، ہندوستان کی مثنوی نگاری کا قدیم ترین نمونہ خیال کی جاتی ہیں۔ خلاصہ کلام یہ کہ میرؔ نے اس صنف میں بھی جو کچھ لکھا ہے اس کا مطالعہ جب اس نظر سے کیا جائے کہ خود میرؔ سے پہلے شاعروں نے کیسی مثنویاں لکھی تھیں اور میرؔ نے اس کی ہیئت اور مواد میں کیسے تجربے کئے ہیں اور یہ کہ میر حسن دہلوی کی مشہور زمانہ مثنوی سحر البیان، یا پنڈت دیا شنکر نسیم کی کلاسیکل مثنوی گلزار نسیم سے پہلے اس صنف میں کتنی پیش رفت ہو چکی تھی۔ تو ہم دیکھیں گے کہ میرؔ کو اس میدان میں بھی ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ ان کی مثنویوں کو پڑھنے کے کئی زاوئے ہو سکتے ہیں۔

مثلاً یہ کہ ان میں میرؔ کے سوانح نگار اور ناقد کے لئے بھی بہت سے مفید مطلب اشارات موجود ہیں، اور انہیں میرؔ کے مورخوں نے استعمال بھی کیا ہے۔ مگر ان کی سوانحی قیمت کا منصفانہ تعین ابھی تک نہیں کیا گیا ہے۔ دوسرا پہلو یہ کہ مثلاً ایک مثنوی میں جس کا عنوان ''خواب وخیال'' ہے، انہوں نے اپنی ابتدائی زندگی اور آگرہ سے ہجرت کا بیان نظم کیا ہے دہلی آ کر انہیں جنون کے حملہ کا مقابلہ بھی کرنا پڑا اس کا حال ان کی خودنوشت ''ذکرِ میرؔ'' میں بھی ہے۔ اور وہی یہاں بھی لکھا ہے کہ مجھے چاند میں ایک چہرہ نظر آتا تھا، جو مست و بے خود بنا دیتا تھا۔ پھر یہاں اس پری وش کا سراپا بیان کیا ہے۔ یہ تفصیل ''میرؔ کی آپ بیتی'' میں نہیں تھی۔ آخر کار عزیزوں نے انہیں کوٹھری میں بند کر دیا اور دوا دارو کے ساتھ ہی ملاؤں اور سیانوں کی تدبیری بھی جاری رہیں۔ اس مثنوی میں اس حجرے کا نقشہ بھی کھینچا ہے جس میں وہ نظر بند ہوئے تھے۔ یہ تفصیل بھی انہوں نے ''ذکرِ میرؔ'' میں نہیں دی ہے۔ پھر کہتے ہیں کہ میری فصد کھولی گئی اور مثنوی سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت بھاری مقدار میں خون برآمد کیا گیا تھا جس کی وجہ سے سخت ضعف ہو گیا تھا اور کئی دن تک میرؔ تکیہ سے سر اٹھانے کے قابل نہیں رہے تھے۔ اس کے بعد وہ چہرہ رفتہ رفتہ نگاہوں سے اوجھل ہوتا گیا۔ تا کہ خواب وخیال ہو کے رہ گیا، اسی لئے میرؔ نے اس مثنوی کا نام بھی ''خواب وخیال'' تجویز کیا ہے۔

سوانحی اہمیت کی دوسری مثنوی ''معاملاتِ عشق'' ہے اس میں بھی انہوں نے اپنی حیاتِ معاشقہ کے کچھ گوشوں کو بے نقاب کیا ہے۔ سچے تجرباتِ عشق پر مبنی مثنویاں قدیم دور میں بہت ہی کم لکھی گئی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ اور شاعروں نے بھی یہ تجربہ کیا ہو لیکن مثنوی معاملاتِ عشق میں کچھ تاریخی واقعات کی طرف اشارے ملتے ہیں جن کی تفصیل تاریخ کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اس مثنوی سے معلوم ہوتا ہے کہ میرؔ نے کسی شادی شدہ خاتون سے عشق فرمایا تھا اور وہ صاحبہ اُن سے بہت احتیاط سے ملتی تھیں۔ یہ عشق ایک سفر میں ہوا تھا جو دہلی سے نسنگ نامی مقام تک کیا گیا تھا۔ اس نام کا ایک گاؤں ضلع کرنال میں آج بھی موجود ہے۔ اس محبوبہ کی فرمائش پر میرؔ نے ایک منقبت بھی لکھی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بھی شیعی عقیدے کی ہوگی۔ اس مختصر سی ملاقات میں میرؔ خوب کھل کھیلے تھے اور بعد میں وہ روابط یاد کر کے کڑھتے تھے۔ اس مثنوی کے گہرے مطالعے سے میرؔ کی جنسی اور رومانی زندگی کے کچھ خاص پہلو سامنے آتے ہیں۔ سوانحی اہمیت کی مثنویوں میں ان کے شکارناموں کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا جو لکھنؤ کے زمانہ قیام میں لکھے گئے تھے۔

تیسرا زاویہ ان مثنویوں کے مطالعہ کا یہ ہے کہ میؔر نے اس ہیئت کو کتنی قدرت کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ ان کے اسلوب میں بیانیہ شاعری کا حق ادا کرنے کی کتنی صلاحیت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ میؔر کی مثنوی بھی غزل کے رنگ سے خالی نہیں ہے۔ ان کی مثنویوں میں متعدد اشعار ایسے ملتے ہیں کہ انہیں اصلی سیاق وسباق سے علیحدہ کر کے پڑھئے تو صاف کسی غزل کا مطلع معلوم ہوتے ہیں، جہاں وہ بہاریہ مضامین باندھتے ہیں، یا روایتی انداز کا ساقی نامہ لکھتے ہیں، یا عشق ومحبت کی فلسفیانہ اور مابعدالطبیعیاتی قسم کی تعریف وتوجیہہ کرتے ہیں وہاں اکثر غزل سے بہت قریب ہو جاتے ہیں۔

چوتھی بڑی خوبی ان مثنویوں کی یہ ہے کہ ان سماجی اور تہذیبی مطالعہ بہت سے دلچسپ نتائج پیش کرتا ہے۔ میؔر نے ایک مثنوی میں اپنے گھر کا حال لکھا ہے اور اسے اندازہ ہوتا ہے کہ میؔر جس سماج میں زندہ رہے اس میں ایسے نابغہ فنکار کی اقتصادی حالت کیسی خستہ ہے اور وہ جس طبقہ کی نمائندگی کرتا ہے، وہ کس طرح کی زندگی گذار رہا تھا، ایک اور مثنوی انہوں نے اپنے گھر کی ہجوم میں لکھی ہے۔ یہ مکان چھپروں کا تھا اور برسات میں اس گھر کی حالت بے حد خستہ وخراب ہو جاتی تھی۔ گھر میں جگہ جگہ مکڑی کے جالے لگے ہوئے تھے۔ چھپر کے بانس جھینگروں نے چاٹ کر کھوکھلے کر دئے تھے۔ گھر کا آنگن کچا تھا، اور اس میں برسات کا پانی بھر کر جو کیچڑ اور گندگی ہوتی تھی، اس کی وجہ سے چلنا پھرنا محال تھا۔ یہی حال گھر سے باہر سڑکوں کا ہوتا تھا۔ اس لئے ایک اور مثنوی میں برسات کی موسم کی شکایت کی ہے۔

سماجی زندگی کا ایک آئینہ تہواروں اور میلوں کی صورت میں بھی نظر آتا ہے۔ میؔر نے بعض مثنویوں شادی کے موضوع پر بھی لکھی ہیں۔ مثلاً ان کی ایک مثنوی بشن سنگھ کی شادی کا حال بتاتی ہے یہ تو انفرادی تقریب ہوئی انہوں نے اجتماعی خوشی کے مواقع ایک تو اس نظم میں بتائے ہیں جو مرغبازوں کی پالی سے متعلق ہے، لکھنؤ کی زندگی میں بے فکری اور فراغت تھی۔ چنانچہ عہد آصف الدولہ میں ایسی تقریبیں کثرت سے ہوتی رہتی تھیں اور اس میں عوام ہی نہیں بلکہ حاکم وقت بھی پوری تندہی سے حصہ لیتے تھے میؔر جب نواب سالار جنگ کی طلبی پر لکھنؤ گئے ہیں تو آصف الدلہ سے ان کی ملاقات ایک ایسے ہی موقع پر ہو سکتی تھی جہاں وہ مرغوں کی لڑائی کا تماشا دیکھنے آئے تھے۔ پولیر کی کتاب میں ایک ایک تصویر بھی موجود ہے جس میں آصف الدولہ کو مرغوں کی جنگ سے دلچسپی لیتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ یہ عوام اور خواص کے تفریحی مشاغل تھے۔ تہواروں میں میؔر نے صرف ہولی کے موضوع پر دو مثنویاں لکھی ہیں۔ آصف الدولہ کے دربار میں ہولی کا جشن بڑی دھوم سے منایا جاتا تھا۔ سارا دربار رنگ میں ڈوب جاتا تھا۔ ہر طرف گلال

اور عبیر اُڑتا نظر آتا تھا۔ گومتی دریا کے دونوں کناروں پر ٹٹیاں باندھ دی جاتی تھیں اور رات کو اس میں چراغاں ہوتا تھا۔ دورویہ ہزار ہا دئے روشن ہوتے تھے۔ پھر ان کا عکس پانی میں پڑتا تھا تو ان کی عجب بہار ہوتی تھی۔ سارا شہر اس چراغاں کا تماشا دیکھنے کو اُمڈ پڑتا تھا۔ ماہر فن کار طرح طرح کے سوانگ رچاتے تھے۔ ہر طرف رقص، رنگ، نغمہ، روشنی اور قہقہے ہی بکھرے ہوئے تھے۔ آتش بازی آدھی رات تک چھوٹتی تھی۔ اور اس میں بھی لکھنؤ کے مخصوص فنکار اپنے بہترین کمالات کا مظاہرہ کرتے تھے۔ سارے شہر کو کاغذی پھولوں سے سجایا جاتا تھا۔ جگہ جگہ راستوں میں بڑے بڑے تخت بچھائے جاتے تھے۔ جن پر شہر کی پیشہ ور رقاصائیں اپنے ہنر کا مظاہرہ کرتی تھیں۔ نوبت اور شہنائی کی آواز فضا میں گونجتی رہتی تھی۔

میؔر نے جتنی عشقیہ داستانیں لکھی ہیں۔ وہ المیہ انجام ہی رکھتی ہیں۔ اس میں فوق الفطری عنصر بھی ضرور ہوتا ہے، وہ بظاہر ٹریجڈی پر ختم ہوتی ہیں مگر یہ فوق الفطرت عنصر اسے کم سے کم تصوراتی حد تک طربیہ بنا دیتا ہے یعنی سماج نے اگر اپنی بندشوں کی وجہ سے عاشق کو محبوب سے زندگی میں نہیں ملنے دیا تو فطرت اس سے زیادہ پایدار وصل کا سامان کر دیتی ہے۔ یعنی دونوں مرجاتے ہیں اور مرنے کے بعد ایک دوسرے سے ایسے بغلگیر ہوتے ہیں کہ چھڑائے نہیں چھوٹتے۔ یہ انجام میؔر ہی کی مثنوی کا نہیں بلکہ اردو کی قدیم داستانوں کا ایک عام انجام ہے، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ فرد میں انقلابی قوت نہیں تھی یا وہ روایات کے حصار کو توڑ کر باہر نہیں نکل سکتا تھا تو اس نے اپنی مجبور فطرت کی تسلی کے لئے یہ طریقہ فکر اختیار کیا تھا۔

میؔر کی مثنویوں میں کردار نگاری یک رخی ہے اس داستان میں زیادہ کردار سامنے آتے ہی نہیں عموماً ایک ہیرو ہوتا ہے، وہ تو مرکزی کردار ہے۔ دوسری ہروین ہے۔ جس طرح ہیرو ایک مثالی عاشق اور عشق پر ایک اعلیٰ اور مثالی قدر کی حیثیت سے غیر متزلزل ایمان رکھنے والا ہے اسی طرح ہیروین بھی حسن وخوبی کا مجسمہ ہے۔ شعرا عموماً اس کا سراپا بیان کرنے کے لئے گنجائش نکال لیتے ہیں۔ سراپا کی یہ روایت فارسی کی نہیں خالص ہندوستانی ہے، اور فارسی کے شاعروں نے بھی اسے سنسکرت سے اخذ کیا ہے۔

ان دونوں بنیادی کرداروں کے علاوہ جو شخصیات پردہ پر آتی ہیں وہ ثانوی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ اور ان کی کردار نگاری پر زیادہ توجہ نہیں دی جاتی لیکن کبھی کبھی ان کی فطرت کی تصویر کشی مخصوص انماز میں ہو جاتی ہے۔ جیسے

دریائے

عشق میں دایہ کا رکردار ہے۔

منظر نگاری، تمثیل نگاری اور مکالمہ نگاری یا پلاٹ کی تنظیم اور بناوٹ کے اعتبار سے بھی ان مثنویوں کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے یہ چونکہ داستان کے ابتدائی نمونے ہیں اور منظوم ہونے کی وجہ سے ان میں کچھ قیود کا اضافہ بھی ہو جاتا ہے اس لئے بہت زیادہ فنی نزاکتوں کی توقع ان سے رکھنی نہیں چاہئے میرؔ نے لکھنے کو تو چھوٹی بڑی ۳۷ مثنویاں لکھی ہیں لیکن انہوں نے عشقیہ مثنویوں میں جو کامیاب نمونے پیش کئے ہیں۔ ان کا گہرا مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ میرؔ حسن نے جب اپنی مشہور مثنوی سحر البیان لکھی تو ان کے سامنے فنی اعتبار سے کامل نمومے آچکے تھے۔ اور یہ فنی نمونے میرؔ کے مرہون منت ہیں۔

میؔر کا اسلوبِ شاعری

سبق ۱۲

ادب بغیر اسلوب کے نہیں بنتا، اور اسلوب میں ساری اہمیت الفاظ ہی کی ہے۔ یعنی مفہوم اور مقصود کے مطابق الفاظ استعمال کئے جائیں۔ یہ نثر میں بھی ضروری ہے۔ مگر نظم میں تو فرض کی حد تک لازمی ہے۔ اس لئے کہ نثر کی خوبی کا تعلق ایجاز واطاب دونوں سے ہے۔ وہاں مفہوم اگر دو سطروں میں واضح نہ ہو تو نثر نگار سے مطالعہ کیا جائے گا کہ وہ چار سطروں میں بیان کرے اور ایسا نہ کرے تو یہ اس کے اسلوب کی خامی ہے مگر شاعری میں تو بڑی پابندیاں ہیں۔ شعر کہنے کا مقصد ہے کسی لطیف اور نازک خیال کو الفاظ کے قالب میں اتارنا۔ یہ عمل ایسا ہی ہے جیسے حاضرات کرنے والے جن بھوت کو شیشے میں اتارا کرتے ہیں۔ حاضرات ایک سفلی عمل ہے۔ ذرا سی بد احتیاطی سے الٹا بھی ہوتا ہے۔ یعنی وہ بھوت جسے شیشے میں اتارنا تھا، خود میؔر صاحب کی گردن پر سوار ہو جاتا ہے۔ یہی حال شاعری کا ہے۔ اگر شعر کہنے والا الفاظ کا صحیح استعمال جانتا ہے تو بڑے سے بڑے خیال کو، نازک اور لطیف ترین افکار کو ایک معمولی سے حرف میں قید کردے گا لیکن اگر اناڑی ہے تو اس کی شاعری خود اس کے گلے پڑ جاتی ہے۔ اوّل تو اس سے کسی کو مسرت حاصل نہیں ہوتی اس لئے کوئی پڑھتا ہی نہیں، اور جو پڑھتا ہے وہ دو چار صلواتیں ہی سنا دیتا ہے۔ پھر نثر میں تو کوئی بھی قید سوائے شرافت ملحوظ رکھنے کے ہم پر نہیں لگائی گئیہے۔ مگر نظم میں سب سے پہلے تو قافیہ ہی تنگ کرتا ہے یہ سارے مضمون کا محور ہے، اور بار بار بدلتا ہے۔ شاعر کی فکر کو آکاش سے پاتال تک سینکڑوں چکر لگوا دیتا ہے۔ پھر اس سے عہدہ برآ ہو گئے۔ تو ردیف کا بھاری پتھر سامنے آتا ہے۔ اگر اسے بھی چوم کے چھوڑ دیا تو گویا اپنی عاجزی کا اعتراف کرلیا، اس لئے شاعر کی قدرت یہ ہے کہ ردیف کو لے کر ایسے اُڑ جائے جیسے ہندو دیومالا کے مطابق ہنومان جی نے لنکا کو ہتھیلی پر اٹھایا تھا۔

میؔر کا حال یہ ہے کہ وہ نہایت ادنی سے لفظ کی اہمیت سے بھی غافل نہیں ہوتا، بلکہ جس لفظ کو عام شعراء بھرتی

کے طور پر لاتے ہیں یا اس کی طرف قطعاً التفات نہیں کرتے، میرؔ اسے بنیادی پتھر کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ مثلاً کچھ، سا، سی، پہ، اب، تس پر، وغیرہ وہ الفاظ ہیں کہ انہیں کوئی شاعر اپنے زعمِ قدرت سخن میں پاس بٹھانے کا روادار بھی نہیں، چہ جائے کہ اپنے کسی شعر میں میں رارا لہام بنا کر متعین کر دے۔ اس لئے کہ ان کی لفظی اور معنوی حقارت کے پیش نظر وہ امید نہیں کرتا کہ ان سے کوئی خدمت بن پڑے گی۔ مگر میرؔ کا سارا دیوان ایسے ہی الفاظ سے شورانگیز بنا ہوا ہے۔ خط کشیدہ لفظوں پر غور فرمائیے:

وصل اس کا خدا نصیب کرے
میرؔ جی چاہتا ہے کیا کیا کچھ

....

نازکی اس کے لب کی کیا کہئے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

ان اشعار کے محاسن اور فنی نزاکتیں غور و تامل کے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتیں اسلوب اور الفاظ کی اہمیت کا میرؔ نے ایک ہی طرح احساس یا اظہار نہیں کیا، اس کی جتنی امکانی صورتیں ہوسکتی ہیں، جن سے معانی میں تہ داری اسلوب میں شیشہ کاری اور مفہوم میں کیف و اثر پیدا ہوسکتا ہے، ان سب کو پورے سلیقے کے ساتھ برتا ہے۔ یعنی کہیں تکرار الفاظ سے لطف پیدا کرتا ہے، کبھی لب و لہجے سے، کہیں مفہوم کو واضح کرنے کے لئے صرف خطوط سے کام لیتا ہے، کبھی مبالغہ کرتا ہے، اکثر معمولی الفاظ سے بڑے مفہوم کو سامع تک پہنچانا چاہتا ہے۔ کبھی پیش پا افتادہ موضوعات میں حکمت و بصیرت کے پہلو دیکھتا ہے کبھی تشبیہات میں ندرت اور نزاکت پیدا کرتا ہے۔ یہ سارے محاسن جن کا براہ راست علاقہ اسلوب سے ہے اس کے کلام میں پائے جاتے ہیں اور ان میں ہر خوبی دوسری پر حاوی نظر آتی ہے لیکن ایسا ہے نہیں جس طرح ایک مشین میں ہر کل پرزے کی حتی کہ اکی معلولی سے پیچ اور قلابے کی اہمیت ہے لیکن وہ پوری مشین نہیں ہے۔ نہ تنہا اس کے مقصد کو انجام دے سکتا ہے، اسی طرح ان محاسن کے فرداً فرداً جائزے کے وقت یہ ضرور یاد رکھنا چاہئے کہ یہ بڑی تصویر کا ایک خط ہیں، پوری تصویر نہیں ہیں۔

میر نے ایہام کی عملاً نفی کی ہے، لیکن ایسا نہیں کہ ان میں اگر خیر کا کوئی پہلو تھا تو اسے نظرانداز کر دیا ہو، اسی ایہام کا فائدہ رعایت لفظی کی شکل میں اٹھایا ہے۔ کبھی ایک ہی رشتے کے الفاظ فراہم کرتا ہے۔ کبھی ایک لفظ کے متعدد پہلو ہوتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک سے کام لیتا ہے۔ مثلاً یہ شعر دیکھئے:۔

آنکھوں میں جی مِرا ہے، اِدھر دیکھتا نہیں
مرتا ہوں میں تو ہائے رے صرفہ نگاہ کا

اب اس میں ''صرفہ'' کے لفظ پر غور کیجئے۔ اس کے تین معنی ہیں، اردو سے قدیم کے محاروے میں صرفہ کنجوسی کے معنوں میں بولا جاتا تھا جیسا کہ میر نے ایک اور جگہ بھی کہا ہے۔

ان صحبتوں میں آخر جانیں ہی جاتیاں ہیں
نے عشق کو ہے صرفہ نہ حسن کو محابا

یہاں صرفہ جھجک اور کنجوسی کا مفہوم ہی ادا کر رہا ہے۔ دوسرے معنی خرچ کرنے کے بھی ہیں جیسا کہ ہمارے زمانے میں بھی بولا جاتا ہے، اور تیسرے یہ صرف سے مشتق ہے، اس کے معنی پھرنے کے ہیں۔ یہی ایک لفظ شعر میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے ساتھ پورا اڈراما ذہن میں رکھئے تو معلوم ہوگا کہ میر کے اسلوب کی خوبی یہ بھی ہے کہ اس نے الفاظ کی تکرار سے مفہوم میں وسعت اور اثر پیدا کرنے کا یا تصویر کشی کا کام لیا ہے۔ دوسری صنف کے شعرا کو چھوڑ دیجئے۔ میر کے ہم رتبہ شعرا میں درد اور سودا کے کلام میں یہ صنعت اتنی کثرت اور ایسی سہولت سے استعمال نہیں ہوئی ہے۔ یہ بڑا نازک مرحلہ ہے۔ اگر شاعر نومشق ہو یا الفاظ کے مزاج اور نفسیات اور اندرونی فضا سے پوری طرح آشنا نہ ہو تو ایک لفظ کی بے جا تکرار سے سارے شعر کا حسن غارت کر دئے گا۔ کیونکہ لفظ کا اثر صرف مفہوم ہی پر نہیں پڑتا، اسلوب سے بھی اتنا ہی گہرا ربط ہوتا ہے اور شعر میں تو موسیقی اور آہنگ بھی الفاظ ہی سے پیدا ہوتا ہے مگر میر نے تکرار الفاظ میں وہ وہ شاعرانہ کمالات دکھائے ہیں کہ یہ اس کے اسالیب شعری کی خصوصیت بن گئی ہے کبھی تو وہ تکرار الفاظ سے وہاں کام لیتا ہے جہاں بڑی فضا کا احاطہ مقصود ہو، کبھی وسیع مفہوم کو بند کرنے کے لئے کبھی انہیں جنس یا نوع کے بیان کے واسطے لاتا ہے۔ مثلاً یہ اشعار دیکھئے:

عالم عالم عشق وجنون ہے، دنیا دنیا تہمت ہے
دریا دریا روتا ہوں میں، صحرا صحرا وحشت ہے

اس میں عالم عالم، دنیا دنیا، دریا دریا، صحرا صحرا کی تکرار سے جو کیفیت پیدائی ہے۔اسے دوسرے الفاظ میں بیاد کرنا اگر ممکن ہوتا، تو میرؔ ہی یہ ذریعہ کیوں اختیار کرتا!

چلتے ہوتو چمن کو چلئے، کہتے ہیں کہ بہاراں ہے
پات ہرے ہیں پھول کھلے ہیں کم کم بادو باراں ہے

....

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

....

رنگ شکستہ دل ہے شکستہ، سر ہے شکستہ مستی میں
حال کسو کا اپنا سا اس مے خانے میں خراب نہیں

....

دل تڑپے ہے، جان گھلے ہے، حال جگر کا کیا ہوگا
مجنوں مجنوں لوگ کہیں ہیں مجنوں کیا ہم سا ہوگا

....

جم گیا خوں کف قاتل پہ زبس تیرا میرؔ
ان نے کل رو رو دیا ہاتھ کو دھوتے دھوتے

....

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
اس کی آنکھوں کی نیک خوابی ہے

میرؔ کی شاعری میں اتنا کاڑھا ہوا لہجہ تھا ملتا ہے جو اس عہد کے اور کسی شاعر کے ہاں نظر نہیں آتا۔ یہ اسلوب کی جان ہے۔ اور بلاغت کی تکمیل اسی سے ہوتی ہے۔ یہ ان تین صفات سے مرکتب ہوتا ہے جنہیں میرؔ ''صفائے گفتگو'' ''ادابندی'' اور ''خیال'' کی اصطلاحوں میں یاد کرتا ہے۔ یہ باتیں کرنے کا انداز ہے۔ لیکن اس طرح نہیں کہ کہنے اور سننے والے میں کوئی فصل، فوق مراتب، نامانوسیت یا ذہنی اور نفسیاتی بعد ہے، بلکہ اس میں من وتو کا فرمٹ جاتا ہے، اسی لئے شاعر کبھی خود سے مخاطب ہوتا ہے کبھی اپنے تئیں اپنا غیر سمجھ لیتا ہے، کبھی بے جان اشیاء کو مخاطب کرتا ہے، کہیں گفتگو کا لب ولہجہ حکیمانہ وعارفانہ ہے، کبھی وہ نرا مجذوب نظر آتا ہے، وہ ان باتوں کے پردے میں حقائق اشیا ر بیان کرتا ہے، کنہ کائنات کا سراغ لگاتا ہے، انسان کی روح سے شناسائی پیدا کرتا ہے، اپنے ذہنی افق کی پیمائش کرتا ہے، اور سب سے بڑی بات جو اس لب و لہجے کے سوا کسی دوسرے ذریعے سے ممکن نہ تھی کہ یہ اپنی لمحاتی کیفیتوں کو الفاظ کے قالب میں ڈھال کر ہمارے ذہنوں تک منتقل کر دیتا ہے۔ اسی لئے اس کی باتوں میں شیرینی محسوس ہوتی ہے، اور اکثر یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ ہماری گریزاں کیفیتوں کا بیان ہوا ہے اور خود میرؔ کو بھی اس کا احساس ہے چنانچہ وہ کہتا ہے۔

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سنئے گا
کہتے کسی کو سنئے گا تو دیر تلک سر دھنئے گا

دیر تک سر دھننے کی علت یہی ہے کہ وہ اپنی ہی نفسی واردات محسوس ہوں گی اس لب و لہجے نے میرؔ کے کلام میں چند ممتاز خوبیاں پیدا کر دی ہیں، یا ان خوبیوں نے یہ دلنشین لب ولہجہ بنایا ہے، یعنی وہ سادہ بلیغ، پراثر ارترنم سے بھرپور الفاظ لاتا ہے، اور انہیں اعتماد کے ساتھ ادا کرتا ہے۔ اس سے واردات کی صداقت اور مانوسیت کا احساس پیدا ہوتا ہے، پھر ان ہی باتوں نے اسے کائنات کے ذرّے ذرّے سے سرگرشیاں کرنے کی ادا سکھائی ہے۔ وہ سامنے بکھری ہوئی معمولی اور بظاہر غیر اہم چیزوں سے اپنی دوستی اور دلچسپی یا واقفیت اور محرمی کا اظہار کرتا ہے۔ اس سے قوت

مشاہدہ کے جوہر کھلتے ہیں۔اور یہی لب ولہجہ شاعر کی عظمت کا احساس دلاتا ہے۔حضرت آثر لکھنوی کا ایک شعر ہے:۔

میں میر کا دم بھرتا ہوں آثر میں اس کے کلام کا شیدا ہوں
ہاں شعر تو تم کہہ لیتے ہو وہ بول بنانا مشکل ہے

''بول بنانا'' موسیقی کی ایک اصطلاح ہے، اور یہ میر کا طرہ امتیاز ہے بات کو سیدھی طرح کہہ دینا اور اسے دل میں اتار دینا دو مختلف باتیں ہیں۔حالی نے غالب کے مرثیہ میں لکھا ہے:۔

لاکھ مضمون اور اس کا ایک ٹھٹول
سو تکلیف اور اس کی سیدھی بات
دل میں کھبتی تھی وہ اگر بہ مثل
دن کو دن کہتا اور رات کو رات

سیدھی بات میں یہ خاطر نشیں ہو جانے کی ادا اصلاً لب و لہجے ہی سے پیدا ہوتی ہے اس کے ساتھ ہی اظہار میں صداقت اور بیان میں وثوق بھی ضروری ہے اور یہ شخصیت کا جزو ہوتا ہے، کسی کمال نہیں، وہی ملکہ ہے، لب و لہجے کی مثال کے لئے میر کے یہ اشعار دیکھئے:

کیا خوبی اس کے منھ کی اے غنچہ نقل کرئے
تُو تو نہ بول ظالم بو آتی ہے وہاں سے!

شعر سے ظاہر ہوتا ہے، غنچے سے شاعر مانوس ہے اور بے تکلف باتیں کر رہا ہے اسے غنچے کی صورت دیکھ کر محبوب کا ذہن یاد آتا ہے، اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ غنچہ اس کی نقل کر رہا ہے۔لیکن مقابلہ کرتا ہے تو ذہن محبوب اور غنچے میں بڑا فرق ہے اور یہ غنچے کی بے جا جسارت ہی ہے کہ وہ اس کی نقل اڑائے۔لب و لہجے کی نرمی اور مانوسیت یہ ظاہر کرتی ہے فی الحقیقت اسے غنچہ پر غصہ نہیں آرہا ہے، کیونکہ نقل اچھی ہو یا بری بہر حال ایک محبوب شے کی ہے۔اس لئے جھنجھلاہٹ کی جگہ طنز کا پہلو اختیار کیا ہے۔جب اسے ٹوکتا ہے تو غنچہ گویا اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتا ہے (فی الوقع وہ آہستہ آہستہ کھل رہا ہے) یہ تبسم دیکھ کر شاعر سوچتا ہے کہ جب میرا محبوب بات کرتا ہے تو اس کی شان ہی دوسری ہوتی

ہے۔ غنچے کا اس کے ذہن کی نقل کرنا ہی ایک جسارت ناروا تھی، اب وہ تکلم کا بھی خاکہ اڑانے چلا ہے تو جیسے بیزری سے منہ پھیر لیتا ہے۔

تُو تو نہ بول ظالم، بو آتی ہے وہاں سے!

دوسرے مصرع کا پہلا ٹکڑا بیزاری میں اضافے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ 'ظالم' ایسی جگہ آیا ہے کہ اس سے پیار بھری نفرت ظاہر ہوتی ہے جو غنچے سے مانوس ہونے کی طرف بھی اشارہ کررہی ہے، اور مصرع ثانی کے دوسرے ٹکڑے کی خوبی یہ ہے کہ جیسے نام سکیڑ کر، ماتھے پر بل ڈال کر منہ پھیر لیا۔ 'بو آتی' ہے وہاں سے!

میؔر کے کلام میں اثر اور صداقت سادگی سے پیدا ہوتی ہے اور یہ سادگی لب و لہجے سے۔ اور یہ سارے عناصر مل کر اس کی انفرادیت کی تشکیل کرتے ہیں۔ میر کی انفرادیت کو سمجھنے کے لئے اس کے ایسے اشعار سے بہت مدد مل سکتی ہے، جن میں اس نے خود اپنے آرٹ یا اپنے فنی تصورات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مثلاً اس کا ایک شعر ہے۔

شعر میرے ہیں سب خواص پسند
گو مجھے گفتگو عوام سے ہے

یہ شعر میؔر کی شاعری کے عام انداز اور ان کے اسلوب اور الب و لہجے کا مظہر ہے میؔر خود اپنی شاعری کو ''خواص پسند'' کیوں سمجھتا ہے، یہ مسئلہ تو دوسرے شعر سے حل ہوگا جو آگے درج کیا گیا ہے، یہاں یہ جان لینا چاہئے کہ میؔر کی شاعری میں جو احساس کی شدت اور ادراک کی تیز رسی ہے اور انقباض و انبساط کی جن نفسیاتی کیفیتوں اور لمحاتی واردات کو اس نے بیان کیا ہے یا زندگی کا جو فلسفہ پیش کیا ہے، یا وہ ذہنی کرب جو اشیاء کی ماہیت سے آگاہی کے بعد ایک حساس شاعر کے نصیب میں آسا ہے، یا جن معمولی تجربات اور واردات کو وہ پیکر شعر عطا کرتا ہے، یہ ساری کیفیتیں خواہ ان کا تعلق حقائق اشیاء سے ہو یا عشق مجازی سے، غم روزگار سے ہو یا غم جاناں سے، صرف خواص ہی محسوس کر سکتے ہیں۔ غم عشق کی دولت ہر بوالہوس کو ملتی ہے، نہ غم روزگار کا اتنا شدید احساس ہر شخص کو ہو سکتا ہے۔ پھر یہ کہ میؔر کی کی شاعری میں اظہار و ابلاغ کی جو خوبیاں ہیں، معانی و بیان کے پہلو، انداز و ادا کے رموز اور معنوی نہ داری ہے، اس کا ادراک بھی عام لوگ نہیں کر سکتے اس لئے میؔر کا یہ دعویٰ بے جا نہیں کہ اس کی شاعری سے خواص ہی لطف

اندوز ہو سکتے ہیں جو اس کے موضوعات شاعری سے ذہنی مطابقت رکھتے ہوں۔ اور میر کی نفسی افتاد میں اس کے شریک ہونے کی صلاحیت ان میں موجو ہو، جو نہ صرف غزل کے ظاہری محاسن اور آرٹ کی باریکیوں کو سمجھ سکیں بلکہ اس کی معنوی فضا سے بھی شناساں ہوں، اس کے ساتھ ہی میرؔ کہتا ہے کہ میں ''عوام سے گفتگو'' رکھتا ہوں، یہ اپنے لب و لہجے کی طرف اشارہ ہے یعنی وہ کیفیات جنہیں خواص ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اور وہ لطیف احساسات جو عام دلوں پروار نہیں ہوتے بلکہ دیدہ دروں اور بیدار دل خواص ہی کے حصے میں آتے ہیں، انہیں اتنی چابکدستی اور سہولت سے الفاظ میں قید کردیتا ہوں کہ وہ ''گفتگو ے عوام'' معلوم ہونے لگتے ہیں۔ جیسے کوئی بہت ہی نازک اور دقیق وجدانی کیفیت اتنی آسانی سے بیان ہو جائے کہ دوسرا شخص اسی شدت اور لطافت کے ساتھ اسے محسوس کرلے جیسے وہ کہنے والے کہ ذہن میں وارد ہوئی تھی۔ اسی مصرع کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ میرؔ کی زبان دہلی کی عوامی بولی سے قریب رہی ہے۔ انہوں نے بقول محمد حسین آزاد جامع مسجد کی سیڑھیوں کے محاروے کو سند جانا ہے۔ اس کی تصدیق ان کے کلام سے بھی ہوتی ہے۔ انہوں نے عوامی بولی کے الفاظ بے تکلف اپنی شاعری میں استعمال کئے ہیں۔ اس کی تفصیلی بحث اور تجزیہ میرؔ کی شاعری کے لسانیاتی مطالعے کے ذیل میں آتا ہے۔ اور ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ بہرحال میرؔ کی اس راز سے باخبر تھا کہ زبان کا عام چلن ہی سند اور معیار ہوتا ہے اور سی سے زبان میں لچک اور وسعت آتی ہے، اور نئے اسالیب کے راستے کھلتے ہیں۔ چنانچہ وہ عوامی بولی کو اپنے عارفانہ و حکیمانہ مضامین کے ابلاغ کے لئے استعمال کرتا ہے۔

میرؔ کے اسلوب کی جن خوبیوں کا اب تک ذکر کیا ہے ان کے امتزاج نے اس کی شاعری کے بڑے حصے کو سہل ممتنع بنا دیا ہے۔ شاعری میں اسے بیان کی معراج سمجھا جاتا ہے کہ بظاہر بات بہت معمولی لفظوں میں اور نہایت آسان انداز میں کہی گئی ہو لیکن دوسرا جب تقلید میں کہنے بیٹھے تو دانتوں پر پسینہ آجائے۔ فارسی میں حافظ اور سعدؔی کے کلام کا اکثر حصہ ایسا ہی ہے، اردو میں میرؔ اور غالبؔ کے یہاں یہ وصف ملے گا۔ اس کا خاصہ ہے کہ نہایت گہری ایمائیت اور معانی کی وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً اسی شعر کو دیکھیے جو ہم نے اوپر لکھا ہے:۔

کہا میں نے گل کا ہے کتنا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

اس کے بیان کی سادگی سے دھوکا کھا کرا کثر مطلب غلط تو نہیں مگر کم سمجھ لیا جاتا ہے یعنی شاعر کہتا ہے کہ کلی نے مسکرا کر یہ ظاہر کیا کہ گل کا ثبات بقدر یک تبسم ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے، اتنی بات تو ہر شاعر کہہ سکتا تھا۔ میؔر نے کلی کے تبسم کو طنز بتایا ہے کہ ارے سادہ لوح گل میں ثبات نام کی چیز ہے ہی نہیں، کلی جب کھلی تو گویا پھول بننا شروع ہو گئی، اور زوال کی منزل طے کرنے لگی۔ اسے ''ثبات'' کب کہا جا سکتا ہے؟ یہ تو مارج فنا ہیں۔ خلاصہ یہ کہ گل کو ثبات نہیں ہے۔ میؔر کی طرح یہی مضمون دردؔ نے بھی اپنے مخصوص انداز میں نظم کیا ہے۔

اس گلشن ہستی کی عجب دید ہے لیکن
جب آنکھ کھلی گل کی تو موسم ہے خزاں کا

یعنی گل کی آنکھ کھلتے ہی خزاں پر ہے، ہماری ظاہر بین نگاہیں بہار کے مکمل اختتام کو خزاں کی آمد سمجھتی ہیں، لیکن شاعر کا واقف کار ذہن اور تہ رس ادراک یہ دیکھ لیتا ہے کہ بہار بھی خزاں کی منزل کا راستہ ہے۔ غم حقیقت ثابتہ ہے۔ خوشی کا نہ ہونا ہی غم ہے، اور خوشی کی یاد بھی غم ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ یہ کیفیت پایدار اور وہ عبوری ہے اسے قنوطیت، یاس پسندی، حقائق سے فرار جو نام چاہیں وے لیجئے ہم اس سے چاہے متفق نہ ہوں، منکر نہیں ہونا چاہئے۔ کیونکہ بہر حال یہ بھی زندگی کا ایک رخ ہے۔

یہ میؔر کی شاعری کے اسلوب کے چند عناصر ہیں جن سے اس کا مجموعی مزاج تشکیل پاتا ہے۔ ان سے پوری طرح باخبر ہونے کے لئے ہمیں بیک وقت کئی پہلوؤں پر گہری نگاہ رکھنی ہوگی یعنی میؔر کا سیاسی اور ادبی سماج، اس کی انفرادی زندگی کے اتار چڑھاؤ، اور ان سب حالات کا اس کی شاعری میں نعکاس ہے ساتھ ہی ہمیں اس عہد کا معاشی نظام بھی سامنے رکھنا چاہئے جس نے اقتصادی سطح پر انسانوں کو ہزاروں خانوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ پھر ساری ادبی تحریکیں، ان کی عوام وخواص کے ذہنوں پر گرفت، شرافت وفضیلت کے معیار اور عام زندگی کے دوسرے بنیادی مسائل۔ یہ سب میؔر کی شاعری پر کسی نہ کسی طرح اثر انداز ہوئے ہیں۔

میر تقی میرؔ بحیثیت نقاد

سبق ۱۴

مقاصد :

اس باب کا مقصد آپ کو میرؔ کی تنقید نِگاری سے واقف کرانا ہے۔اس میں تذکرۂ میرؔ ''نکات الشعراء'' کے حوالے سے طلبہ کو میرؔ کے تنقیدی شعور اور اُن کی تنقیدی صلاحیت سے آگاہ کروایا جائے گا۔

تمہید :

اُردو تنقید کے اولین خدوخال ہمیں اُردو شعراء کے تذکروں میں نظر آتے ہیں۔ان تذکروں میں میرؔ کے ''نکات الشعراء'' کو اولیت حاصل ہے۔ جو اپنے دور کے اعتبار سے تنقید کا ایک بہترین نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ ''نکات الشعر'' میں میرؔ نے نہایت سنجیدگی اور خلوص سے کام لِیا ہے۔اس میں تنقید کے مصفانہ اور غیر جانب دارانہ اشارے مِلتے ہیں۔ذیل کے باب میں اس پر تفصیل سے بات کی جائے گی۔

میر تقی میرؔ بہ حیثیتِ نقاد :

قدیم تنقید پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو اس کا سلسلہ ہمیں تذکروں تک لے جاتا ہے۔اُردو میں تنقید کے ابتدائی نقوش ہمیں تذکروں میں ہی ملتے ہیں۔اُردو میں تذکرہ نویسی کا رواج فارسی کے زیرِ اثر ہوا۔ چناں چہ اُردو شعراء کے تذکرے بھی بالکل اسی طرز میں لکھے گئے ہیں۔جس میں فارسی شاعری کے تذکرے لکھے جاتے رہے ہیں۔ظاہر ہے یہ تذکرے زیادہ تر اپنے ذوق کی تسکین یا دل چسپی کے لئے لکھے گئے ہیں۔اس لئے ان کے اندر سختی سے کسی ایسی چیز کو تلاش کرنا جو ادبی، فنی نقطۂ نظر سے مکمل ہو مناسب نہیں ہے۔دیکھنا تو یہ ہے کہ انفرادی، ذاتی اور شخصی حیثیت کے حامل ہونے کے باوجود کسی حد تک ان میں غیر شعوری طور پر وہ عناصر پیدا ہو گئے ہیں جن کو ادبی، فنی اور

تنقیدی اہمیت حاصل ہے۔

عام طور پر ان تذکروں میں تین چیزیں پائی جاتی ہیں۔ایک تو شاعر کے مختلف حالات، دوسرے اس کے کلام پر مختصر سا تبصرہ اور تیسرے اس کے کلام کا انتخاب۔ان تذکروں میں زیادہ تر ایسے ہیں جو کسی خاص حلقے کی ترجمانی کرتے ہیں یا کسی خاص نقطۂ نظر سے لکھے گئے ہیں اور جن میں جانب داری کا عنصر غالب ہے۔تاہم چند تذکرے ایسے بھی ہیں جو بڑی حد تک خلوص، نیت، دیانت داری اور صداقت کے حامل ہیں۔اس قسم کے تذکروں میں میر تقی میرؔ کا تذکرہ ''نکات الشعراُ''سرِ فہرست ہے۔

اُردو شاعری کے تذکروں میں میرؔ کے''نکات الشعراء'' کو اولیت حاصل ہے۔یہ تذکرہ میرؔ نے فارسی زبان میں لکھا ہے جو 1752ء میں مکمل ہوا۔حالانکہ اسی سال دو اور تذکرے''گلشنِ گفتار'' (خواجہ اورنگ آبادی) اور ''تحفۂ الشعراء'' (مرزا افضل بیگ خان) بھی لکھے گئے مگر اولیت نکات الشعراء کو ہی حاصل رہی''گفتار'' دراصل دکنی شعراء کا تذکرہ ہے اور اس میں محض تیس شاعروں کا ذِکر ہے۔جس میں پندرہ شاعر دکن کے ہیں۔میرؔ کا ذِکر اس تذکرے میں نہیں ہے۔اسی طرح تحفۂ الشعراء میں کل 62 شاعروں کا ذِکر ہے اور یہ سب شاعر آصف جاہ اوّل اور ناصر بیگ کے عہد کے ہیں۔اس تذکرے میں بھی میرؔ کا ذِکر ہے۔

جیسا کہ اوپر ذِکر ہو چکا ہے''نکات الشعراء'' فارسی نثر میں اُردو شاعری کا تذکرہ ہے جِسے شمالی ہند کے تذکروں میں شرفِ اولیت حاصل ہے۔اس میں 103 اُردو شاعرون کے مختصر حالات اور اُن کا منتخب کلام شامل ہے۔میرؔ کا یہ تذکرہ اپنے مواد کے اعتبار سے بیش قیمت ادبی معلومات کے خزانے کی حیثیت رکھتا ہے۔اس میں ظاہر کی گئی رائے کے پیچھے تنقید کا ایک تصور مضمر ہے۔دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ان اصطلاحات سے کون سے تصور وابستہ ہیں اور ان کے پیچھے یعنی کہ کون سی کائنات پوشیدہ ہے۔

''نکات الشعراء'' کی پہلی خوبی حالات کا بیان ہے جس سے شاعر کی شخصیت اور ماحول کا تھوڑا سا اندازہ ہو جاتا ہے۔ہر چند کہ یہ بیان بہت ہی مختصر ہے تاہم اس سے شاعر کی زندگی اور اس کے ماحول کا ایک دھندلا سا خاکہ ضرور آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔چناں چہ شاعر کے کلام پر تبصرہ اور کلام کے اِنتخاب سے قبل یہ دُھندلا سا خاکہ پیش کر دینا بھی ایک اہمیت رکھتا ہے کیونکہ یہ چیزیں شاعر کی افتادِ طبع اور ماحول کو سمجھنے میں کسی نہ کسی حد تک ضرور معاون

ثابت ہوتی ہیں۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ''نکات الشعراء'' کی اہمیت ادبی نہ ہو کر تاریخی ہے۔ظاہر ہے تذکرہ نویس نے کسی شاعر پر مکمل تنقیدی مضمون نہیں لکھے ہیں کہ جس کی وجہ سے پس منظر اتنا اُجاگر ہو جاتا کہ اس کی حیثیت تاریخی سے ادبی ہو جاتی۔میر کا مقصد تو صرف اپنے تنقیدی نقطۂ نظر کے سہارے اس کے بہترین اشعار کا انتخاب پیش کرنا ہوتا تھا۔اس لئے اگر انہوں نے شاعر کی زندگی،شخصیت اور اس کے ماحول کی جھلک بھ دکھادی تو یہ بھی بڑا کام ہوا۔

میر تقی میر نے اس تذکرہ میں مختلف شاعروں کی زندگی کے جو حالات لکھے ہیں اور ان کی سیرت کا جو بیان کیا ہے،ان ہی سے ان شاعروں کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔سراج الدین علی خان آرزُو کے بارے میں جو میر نے لکھا ہے اس سے خان آرزُو کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے اور اس ماحول میں اُن کی شخصیت کا پوری طرح اندازہ ہو جاتا ہے۔اس طرح مظہر خان جاں سے متعلق،شاکر ناجی ہودا اور میر درد کے متعلق لکھے گئے تذکرے خاص اہمیت کے حامل ہیں۔میر نے نہایت ہی تنقیدی نقطۂ نظر سے تمام شعراء سے متعلق جانکاری باہم پہنچائی ہے۔انہوں نے گاگر میں ساگر بھرنے کا کام کیا ہے اور نہایت ہی اختصار کے ساتھ انہوں نے شاعروں کے حالات ماحول اور سیرت کا نقشہ پیش کرتے ہوئے اُن کے دل کش خاکے کھینچے ہیں۔

اگرچہ میر کے پیش کئے ہوئے یہ خاکے مختصر ہیں۔لیکن اس کے باوجود یہ مکمل معلوم ہوتے ہیں۔انہوں نے حالات کے بیان کے ساتھ ساتھ ماحول پر روشنی ڈالی ہے۔اس وجہ سے ان کی سیرت نگاری میں زیادہ جان پیدا ہوگئی ہے۔ڈاکٹر عبداللہ کے مطابق نکات الشعراء کا شاندار ترین وصف اس کی سیرت نگاری ہے۔ایک تذکرہ نگار کے لئے لازمی ہے کہ وہ اپنے اشخاص کی زندگی اور واقعات کو ایسے پُر معنی ایجاز و اختصار سے بیان کرے جس سے ان اشخاص کی پوری سیرت آنکھوں میں گھوم جائے۔نکات الشعراء میں ایجاز و اختصار کے ساتھ ان شاعروں کی سیرتوں کا بیان، ان کے کلام کی تنقید کے سلسلے میں پس منظر کا کام کرتا ہے،اسی وجہ سے وہ اہم ہے۔

''نکات الشعراء'' میں میر نے جہاں بہ طورِ نمونہ اشعار پیش کئے ہیں وہیں شعرا کے کچھ اشعار کو بہ نظرِ اصلاح بھی دیکھا ہے۔اس سے نہ صرف اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ میر کو اصولِ فن سے گہری واقفیت تھی بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انھیں شعر کی قدر و قیمت کو پرکھنے کا غیر معمولی ملکہ حاصل تھا۔میر نے اپنے پورے تذکرے میں صرف چند اشعار

پر ہی اصلاحیں دی ہیں اوران میں زیادہ تر اشعار وہ ہیں جو میرؔ کی اصلاح کے بعد زیادہ بہتر صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

''نکات الشعراء'' کی تنقیدی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اُردو شعراء کے قدیم ترین تذکروں میں سے ہے اور ہمارے شعر و ادب کی تاریخ اور تنقید کے سلسلے میں ماخذِ اول کی حیثیت رکھتا ہے۔''نکات الشعراء'' کی تنقیدی اہمیت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے مولوی عبدالحق لکھتے ہیں۔اس میں عموماً اور اکثر شعراء کے کلام پر منصفانہ اور بے باکانہ تنقید پائی جاتی ہے۔

میر تقی میرؔ اُردو کے پہلے تذکرہ نویس ہیں جنھوں نے صحیح تنقید سے کام لیا ہے اور جہاں کوئی سقم نظر آیا ہے وہاں بے رو در عایت اس کا اظہار کر دیا ہے اور ہر شعر کے متعلق تامل نہیں کیا ہے۔ یہ بات دوسرے تذکرہ نویسوں میں عام طور پر مفقود ہے۔ وہ اپنے گروہ کے شاعروں کی جا بے جا تعریف کرتے ہیں اور حریف گروہ والوں کی تعریف اول تو کرتے نہیں اور اگر کرتے بھی ہیں تو دبی زبان سے اور اس میں بھی کوئی چوٹ ضرور کر جاتے ہیں۔ میرؔ کی شان اس سے بہت ارفع تھی وہ کسی گروہ سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔علاوہ اس کے میرؔ نے شعراء کے حالات بیان کرنے میں بھی تا مقدور صحت سے کام لیا ہے۔اور بعض غلط فہمیوں کو سب سے اوّل انھوں نے رفع کیا ہے۔

اُردو کے بعض ناقدین اور تذکرہ نگار میر تقی میرؔ کے اندازِ تنقید کو توازن خیال نہیں کرتے۔ان کا خیال ہے کہ انھوں نے اپنی خود پسندی کے سبب بعض شعراء کی بے جا تعریف کی ہے اور بعض کو بے سبب لتاڑا ہے۔لیکن یہ صحیح نہیں ہے''نکات الشعراء'' کے مطالعے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ میر نہایت پاک مشرب، مورب و مہذب، زندہ دل یار باش، انصاف اور صفائی سے درج تھے۔ ہر موقع پر اس کی تصریح لازم ہے۔ بے تحقیق کسی بات کا لکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔وہ اپنے معاصرین کا ذِکر بڑے ادب سے کرتے تھے۔

''نکات الشعراء''اگرچہ شعراء کا تذکرہ ہے کوئی تاریخی کتاب نہیں۔تاہم میر نے یہ التزام کیا ہے کہ جو واقعہ تحقیق نہ ہو اُس کو نہ لکھا جائے اور اگر لکھا بھی جائے تو اُس کا غیر محقق ہونا ظاہر کر دیا جائے۔جن شعراء کا حال معلوم نہ تھا وہاں صاف لکھ دیا ہے کہ اُن کا حال معلوم نہیں۔تمام تذکرہ میں ایک بھی لفظ میر کے قلم سے ایسا نہیں نکلا جس سے اُن کی خود بینی و خود پسندی عیاں ہو برخلاف اس کے اپنا ذکر ہر جگہ منکرانہ لہجے میں کیا ہے۔خود کو فقیر اور خاکسار کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ باوجود تہذیب اور انکسار کے جہاں تنقید کی ضرورت تھی وہاں بے لاگ رائے ظاہر کی ہے لیکن اس

کے ساتھ انصاف کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ میرؔ نے جا بجا شعراء کے کلام کی نسبت لکھا ہے کہ اس شعر امیں بجائے فلاں لفظ کے یہ لفظ ہوتا تو خوب ہوتا اِن اصلاحوں سے میرؔ کے مذاقِ صحیح اور مرتبۂ استادی کا پتہ چلتا ہے۔

میر تقی میرؔ فارسی با محاورہ لکھتے ہیں اکثر جگہ پُر لطف الفاظ قلم سے نکل جاتے ہیں۔ اُن کا بیان مبالغہ اور بے جا لفاظی سے پاک ہے۔ وہ اپنے بیان میں جا بجا استادانہ اشارے کرتے جاتے ہیں۔

یہ بات صحیح ہے کہ میر تقی میرؔ نے شعراء کے متعلق بے لاگ آراء پیش کی ہیں۔ ان کی رائے سے ہم اختلاف کریں یا اتفاق اس سے انکار ممکن نہیں کہ وہ شاعری کے ساتھ ساتھ تنقید کا بھی اچھا شعور رکھتے تھے۔ ان کے لسانی اور تنقیدی شعور کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنے تذکرے کے آخر میں ریختہ اور اس کے اقسام کی تعریف کرتے ہوئے فنِ شعر کے معیار کا تعین کرنے کی کوشش کی ہے اور اُن کے ذہن میں جو اُردو شاعری اور اس کے معیارِ فکر و فن کے متعلق جو اُصوُل تھے ان کا اظہار کر دیا ہے۔ اس اعتبار سے میرؔ اُردو شاعری کے پہلے ناقد ہیں جن کے یہاں عملی تنقید سے الگ نظری تنقید کے سلسلے میں بھی بعض اصوُلوں اور راوؤں کی نشان دہی ملتی ہے۔

کتب برائے مُطالعہ :

١۔ میر تقی میرؔ حیات و شاعری از خواجہ احمد فاروقی

٢۔ نکات الشعراء کی اہمیت از ایم۔ اے، فاطمی

٣۔ نکات الشعراء (اردو ترجمہ) از مولوی عبدالحق

۴۔ میر تنقید تذکروں سے عصرِ حاضر تک۔ ریشماں پروین

میر تقی میرؔ کی تذکرہ نگاری

سبق ۱۴

مقاصد :

اس باب میں آپ میر تقی میرؔ کے تذکرے ''نکات الشعراء'' سے متعارف ہوں گے۔اس کے علاوہ میرؔ کی تذکرہ نگاری کی خصوصیات سے بھی جانکاری حاصل کریں گے۔

تمہید :

میر تقی میرؔ ہمارے ان بڑے شعراء میں ہیں جن کی عظمت کا اعتراف نہ صرف ان کے اپنے زمانے میں بلکہ جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا ان کی معنویت مزید مستحکم ہوتی گئی۔میرؔ کی شعری عظمت تو اپنی جگہ ہے ہی لیکن نثری تصانیف جو انھوں نے فارسی زبان میں لکھی ہے میں بھی کوئی ثانی نہیں۔میرؔ کی نثری تصانیف میں تذکرہ ''نکات الشعراء'' خاص اہمیت کا حامل ہے۔اس باب میں میر تقی میرؔ تذکرہ نگاری کے اوصاف بیان کر کے اُن کے ادبی مرتبے کا تعین کیا جائے گا۔ساتھ ہی ساتھ نکات الشعراء کی تنقیدی اور تاریخی اہمیت پر بھی نظر ڈالی جائے گی۔

میر تقی میرؔ کی تذکرہ نگاری :

خدائے سخن، امام الشعرا میر تقی میرؔ کا مرتبہ ادبی حلقوں میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔کون ہے جو میرؔ کے نام اوران کے کلام سے واقفیت اور عقیدت نہ رکھتا ہو۔شاعری کے ساتھ ہی ساتھ میرؔ کی نثری تصانیف کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔میرؔ نے چار نثری تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔''نکات الشعراء''، ''فیضِ میر''، ''دریائے عِشق'' اور ''ذِکرِ میر'' یہ چاروں فارسی زبان میں ہیں۔اور اپنے موضوع کے اعتبار سے مختلف ہیں۔

میر تقی میرؔ کا تذکرہ ''نکات الشعراء'' اُردو شعراء کے تذکروں میں خاص اہمیت کا حامل ہے۔قدیم تذکروں پر تحقیق کرنے والے محقق مثلاً مولوی عبدالحق، محی الدین قادری زورؔ، حبیب الرحمان، حافظ محمود شیرانی،

ڈاکٹر ابوالیث صدیقی اور قاضی سید عبدالودود وغیرہ نے بھی ''نکات الشعراء'' کو ہی مقدم قرار دیا ہے۔ اُردو میں شعراء کی ''تذکرہ نگاری کا آغاز تقریباً اٹھارھویں صدی عِسوی کے وسط سے ہوتا ہے اور آبِ حیات تک برابر قائم رہتا ہے۔ اس کے بعد حقیقتاً تذکرہ نگاری کا دور ختم ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ مغرب کے زیرِ اثر تنقید، تاریخ اور سوانح نگاری لے لیتی ہے۔

'نکات الشعراء' 1752ء میں مکمل ہوا اِس میں 103 شعراء کے حالات درج ہیں۔ یہ تذکرہ احمد شاہ بادشاہ کے عہد کی تالیف ہے جبکہ سلطنت مغلیہ کا چراغ گُل ہو رہا تھا، خانہ جنگیوں اور لوٹ مار کے ہنگامے برپا تھے۔ بدامنی کا دَور دورہ تھا، دائرۂ معاش بہت کچھ تنگ ہو چکا تھا۔ اس پر بھی اُس زمانہ کی معاشرت کی مضبوطی کو دیکھو تمام خطرات اور مصائب سے بالاتر ہو کر اپنی وضع اور صفت پر قائم تھی۔ اس کی بہترین مثال ہمیں میر تقی میرؔ کے تذکرہ نکات الشعراء کے بیان میں نظر آتی ہے۔

''نکات الشعراء'' اُردو شعراء کے قدیم ترین تذکروں میں سے ہے اور ہمارے شعر و ادب کی تاریخ کے سلسلے میں ماخذِ قوّل کی حیثیت رکھتا ہے۔ میرؔ اُردو کے پہلے عظیم شاعر ہیں جنھوں نے اُردو کی جملہ شعری اصناف میں ہی طبع آزمائی نہیں کہ بلکہ تذکرہ 'نکات الشعراء' تصنیف کر کے اپنے عہد کے شعراء اور شاعری کے واضح خدوخال بھی متعین کئے۔

''نکات الشعراء'' کی اہمیت ہمارے ادب میں تنقیدی بھی ہے اور سوانحی و تاریخی بھی۔ اس کی اہمیت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے مولوی عبدالحق رقم طراز ہیں، اس میں عموماً اور اکثر شعراء کے کلام پر منصفانہ اور بے باکانہ تنقید پائی جاتی ہے۔

میر تقی میرؔ پہلے تذکرہ نویس ہیں جنھوں نے صحیح تنقید سے کام لیا ہے اور جہاں کوئی سقم نظر آیا ہے بے رو و رعایت اس کا اظہار کر دیا ہے۔ یہ بات دوسرے تذکرہ نویسوں میں عام طور پر مفقود ہے۔ وہ اپنے گروہ کے شاعروں کی جا بجا تعریف کرتے ہیں اور دوسرے گروہ والوں کی اوّل تو تعریف کرتے ہی نہیں اور اگر کرتے بھی ہیں تو دبے الفاظ میں اور اس میں بھی کوئی طنز یا چوٹ ضرور کر جاتے ہیں۔ میرؔ کی شان اس سے بہت ارفع تھی وہ کسی گروہ سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں میرؔ نے شعراء کے حالات اور ماحول کے بیان میں حقائق کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ اور بعض غلط فہمیوں کو سب سے پہلے انھوں نے رفع کیا ہے۔

یہ امر صحیح ہے کہ میر تقی میرؔ نے شعراء کے متعلق بے لاگ رائیں دی ہیں۔ ان کی رائے سے ہم اختلاف کریں یا اتفاق اس سے انکار ممکن نہیں کہ وہ شاعری کے ساتھ ساتھ تنقید کا بھی اچھا شعور رکھتے تھے۔ ان کے لسانی اور تنقیدی شعور کا اندازہ اُن کے تذکرے نکات الشعراء سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ تذکرے کے اختتام پر انھوں نے ریختہ اور اس کے اقسوام کی تعریف کرتے ہوئے فنِ شعر کے معیار کا تعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُن کے ذہن میں جو اُردو شاعری اور اس کے معیارِ فکر وفن کے متعلق جو اصول تھے ان کا اظہار کر دیا ہے۔ میرؔ نے اس تذکرے میں جو اُصوُل مرتب کئے ہیں ٗکسی زمانے میں فن کو جانچنے اور پرکھنے کے پیمانے ہوا کرتے تھے۔ آج بھی ہم کُلی طور پر نہ سہی جزوی طور پر ہی سہی ان اصولوں کی صداقت سے انکار نہیں کر سکتے۔

اُردو کے بعض ناقدین اور تذکرہ نگار میر تقی میرؔ کے اندازِ تنقید کو متوازن نہیں سمجھتے۔ ان کا خیال ہے کہ انھوں نے اپنی خود پسندی کے سبب بعض شعراء کی بے جا تعریف کی ہے اور بعض کو بے سبب لتاڑا ہے۔ خصوصاً حاتم، یقین، حشمت، خاکسار وغیرہ کے بارے میں میرؔ نے جو کچھ لکھا ہے اُس میں بڑا تلخ لب ولہجہ اپنا ہے۔ لیکن ''نکات الشعراء'' کے مطالعے سے اس بات کا انکشاف ہو جاتا ہے کہ میرؔ پر لگائے گئے یہ الزام بے بنیاد ہیں۔ میرؔ نہایت پاک مشرب، مورب ومہذب، زندہ دل، یار باش، انصاف پسند اور منکر المزاج انسان تھے۔ دوستی کے مراتب اُن کے دستور العمل میں بہت وضاحت اور صفائی سے درج تھے۔ ہر موقع پر اس کی تصریح لازم ہے۔ بے تحقیق کسی بات کا لکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ اپنے معاصرین کا ذکر بڑے ادب سے کرتے تھے۔

نکات الشعراء اگر چہ شعراء کا تذکرہ ہے کوئی تاریخی کتاب نہیں ہے۔ تاہم میرؔ نے یہ التزام کیا ہے کہ جو واقعہ تحقیق نہ ہو اُس کو نہ لکھا جائے اور اگر لکھا بھی جائے تو اُس غیر محقق ہونا، ظاہر کر دیا جائے۔ جس شعراء کا حال معلوم نہ تھا وہاں صاف لکھ دیا ہے کہ اُن کا حال معلوم نہیں ہے۔ تمام تذکرے میں ایک لفظ بھی میرؔ کے قلم سے ایسا نہیں نکلا جس سے اُن کی خود بینی وخود پسندی یا بد دماغی عیاں ہو۔ برخلاف اس کے اپنا ذکر ہر جگہ منکرانہ لہجے میں کیا ہے۔ باوجود تہذیب اور انکسار کے جہاں تنقید کی ضرورت تھی وہاں بے لاگ رائے ظاہر کی ہے لیکن اس کے ساتھ انصاف کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔ میرؔ نے جا بجا شعراء کے کلام کی نسبت لکھا ہے کہ اس شعر میں بجائے فلاں لفظ کے یہ لفظ ہوتا تو خوب ہوتا اِن اصلاحوں سے میرؔ کے مذاقِ صحیح اور مترتبۂ استادی کا پتہ چلتا ہے۔

تنقیدی پہلو سے قطع نظر سوانحی اور تاریخی اعتبار سے بھی 'نکات الشعراء' کی اہمیت مسلّم ہے۔اس کے تراجم کے ذریعے صرف یہی نہیں کہ میؔر کی زندگی اور شخصیت کے بعض اہم اجزا ہمارے سامنے آتے ہیں بلکہ جن شعراء کا ذکر انھوں نے کیا ہے اُن پر اور اُن کے موحول پر بھی ایسی روشنی پڑتی ہے کہ ہمیں ان کی چہرہ نگاری اور سماجی شعور کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ، پر خاکہ بناتے وقت مناسب الفاظ پر غیر معمولی قدرت کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ان کے الفاظ جامع اور پُر معنی ہوتے ہیں۔میؔر نے نکات الشعرء میں ایک سو سے زائد شعراء کے قلمی چہرے پیش کئے ہیں لیکن رنگا رنگ صورتوں میں خود ان کے چہرے کی بھی اصل جھلک موجود ہے۔اس جھلک میں جو باتیں بہت نمایاں طور پر سامنے آتی ہیں وہ ان کے مزاج کی شگفتگی اور خوش خلقی ہے۔

میؔر کے متعلق بعض ناقدین کا یہ خیال ہے کہ وہ ایک افسردہ طبعیت ، خشک مزاج، مردم بیزار اور خلوت پسند آدمی تھے۔نکات الشعراء کی روشنی میں درست نہیں معلوم ہوتا۔میؔر اپنے دوستوں کے خود بھی فقرے چست کرتے تھے اور دوسروں کے برجستہ فقروں کی کھلی داد بھی دیتے تھے۔عرسوں اور میلوں میں بھی شریک ہوتے تھے اور دوسروں کے یہاں شعر وسخن کی محفلوں میں بھی شریک ہوتے تھے۔

میؔر نے نکات الشعراء میں اپنا ذکر سب سے آخر میں کیا ہے۔اس تذکرے میں انھوں نے اپنے حال کا ذکر تو کیا ہے لیکن اپنی شاعری کے بارے میں کوئی رائے نہیں دی ہے۔ انھوں نے اس میں اپنے کلام کا ایک طویل انتخاب دے کر اپنی شاعرانہ اہمیت کا احساس دلا دیا ہے۔ یہ انتخاب ۲۴۸ اشعار پر مشتمل ہے۔اس کے علاوہ انھوں نے اپنی شاعرانہ اہمیت کے اظہار کا ایک گوشہ اور تلاش کرلیا ہے۔ جو خاتمہ کے نام سے نکات الشعراء کے آخری صفحہ پر درج ہے۔ بظاہر اس میں انھوں نے ریختہ کی قسمیں بتائی ہیں۔اور اسے چھ قسموں میں تقسیم کیا ہے جس کی چوتھی اور چھٹی قسم میں انھوں نے اپنی شاعری اور اپنی تعریف کا پہلو بڑی خوبصورتی سے نکال لیا ہے۔ریختے کی چھٹی قسم کو وہ اپنی شاعری سے منسوب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ وہ انداز ہے جسے میں نے اختیار کیا ہے۔

ایک اور بات اہم ہے کہ نکات الشعراء میں میؔر کا ذکر براہ راست نہ ہوتے ہوئے بھی پورے تذکرے پر حاوی نظر آتا ہے۔انھوں نے اپنا جو طویل انتخاب شامل کیا ہے اُس سے اُن کے شعری مذاق کا اندازہ ہوتا ہے۔یعنی اپنے جو اشعار انھوں نے منتخب کئے ہیں وہ بعد کے زمانے میں بھی ان کے اچھے اشعار میں شمار کئے گئے۔اس سے

اندازہ ہوتا ہے کہ میؔر کو جو دسترس زبان اور شاعری پر تھی وہی شعرفہمی پر بھی تھی۔علاوہ ازیں معاصر شعراء کی اصلاح سے بھی ان کی تنقیدی بصیرت اور شعر شناسی کا احساس ہوتا ہے۔

نکات الشعراء کی زبان فارسی ہے، میؔر فارسی زبان بامحاورہ لکھتے ہیں۔وہ اکثر جگہ پر پُر لطف الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔اُن کا بیان مبالغہ اور بے جا لفاظی سے پاک ہے اور جا بجا استادانہ اشارے میں ملتے ہیں۔مولوی عبدالحق کے مترتبہ نسخے کی فہرست کے مطابق اس میں ایک سوتین شاعروں کا ذکر آیا ہے۔یہ تذکرہ حضرت امیر خسرو کے ذکر سے شروع ہو کر میر تقی میؔر یعنی خود مصنف کے ذکر پر ختم ہو جاتا ہے۔نکات الشعراء تنقید اور سوانح دونوں لحاظ سے اُردو شعر وادب کی تاریخ میں بہت اہم ہے۔اس کے ذریعے میؔر اور اُن کے معاصرین اور ماحول کے متعلق بہت سی ایسی باتیں سامنے آتی ہیں جو کسی اور ذریعے سے ممکن نہ تھیں۔

مختصراً نکات الشعراء کی اہمیت کئی طرح سے ہے اوّل تو یہ اُردو کا پہلا تذکرہ ہے اس لئے اس کی تاریخی اہمیت ہے، دوم یہ میر تقی میؔر نے لکھا ہے جو خود عظیم شاعر ہیں۔سوم اس میں ڈھائی پونے تین سو برس قبل کے اُردو شعراء کے بڑے شگفتہ اور کامیاب خاکے ہیں۔ان کے بہترین اشعار ہیں، چہارم اس میں اُردو تنقید کے اولین خدوخال ہیں اُس زمانے کے تنقیدی پیمانے ہیں جو اب گم ہو گئے ہیں اور پنجم یہ کہ میؔر کے تنقیدی پیمانے جانکر ہم ان کی شاعری کا بہترین شعور کرسکتے ہیں۔

کتب برائے مُطالعہ :

۱۔ میؔر کی تنقید تذکروں سے عصرِ حاضر تک۔ ریشماں پروین

۲۔ نکات الشعراء کی اہمیت از ایم۔اے، فاطمی

۳۔ نکات الشعراء (اردو ترجمہ) از مولوی عبدالحق

میر تقی میرؔ کی سوانح نگاری

سبق ۱۵

مقاصد :

اس باب میں میر تقی میرؔ کی سوانح نگاری کی خصوصیات کو پیش کیا گیا ہے۔ اُن کی فارسی تصانیف، ذکرِ میرؔ، اور 'نکات الشعراء' کے تراجم کے حوالے سے اُن کی سوانحی حیثیت کی اہمیت کو اُجاگر کیا گیا ہے۔

تمہید :

میرؔ کے امتیازات میں ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ وہ اُردو کے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے خود اپنی سوانح عمری ''ذکرِ میر'' کے عنوان سے بہ زبان فارسی تحریر کی۔ جس کی اہمیت کے پیشِ نظر اُسے پروفیسر نثار احمد فاروقی صاحب نے اُردو زبان میں ترجمہ کر کے ''میر کی آپ بیتی'' کے عنوان سے شائع کرایا۔ اُن کی دوسری تصنیف ''نکات الشعراء'' بھی تذکرہ نگاری میں اولین حیثیت رکھتی ہے۔ اس کو بھی بابائے اُردو مولوی عبدالحق صاحب نے اُردو میں ترجمہ کر کے اُردو دُنیا میں روشناس کرایا۔ چناں چہ میر تقی میرؔ کی سوانح نگاری کے خدوخال ان ہی دو تصانیف کے حوالے سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

میر تقی میرؔ کی سوانح نگاری :

میر تقی میرؔ کو اُردو شاعری کا خدا مانا جاتا ہے۔ میرؔ کی برتری اور اُستادی کا اعتراف ناسخؔ، غالبؔ اور ذوقؔ جیسے اعلیٰ مرتبہ شعراء نے کیا ہے۔ اس خدائے سخن نے جہاں شاعری کو بلند رتبہ عطا کیا وہیں سوانح نگاری کے میدان میں ''ذکرِ میرؔ'' تصنیف کر کے ایک عظیم کارنامہ انجام دیا۔ ''ذکرِ میرؔ'' میرؔ کی خودنوشت سرانح عمری ہے جو فارسی میں لکھی گئی ہے۔ ''ذکرِ میر'' کی تصنیف کا آغاز کب ہوا اس بارے میں کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی جا سکتی تاہم بعض محققین کا خیال ہے کہ میرؔ نے اُسے ۱۱۸۵ھ سے بہت پہلے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اور آخری عمر تک اس میں اضافہ و ترمیم کرتے رہے

لیکن قاضی عبدالودود فرماتے ہیں کہ یہ کتاب 1771ء میں شروع ہوئی 1788ء میں تمام ہوئی۔ تاہم میؔر اُردو کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے خود اپنی سوانح عمری لکھی اور وہ محفوظ رہ گئی۔

''ذکرِ میر'' فارسی زبان میں ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ خان بہادر مولوی بشیر الدین کو 1808ء میں ملا تھا۔ جس کا اُردو ترجمہ 1926ء میں مولوی عبدالحق نے سہ ماہی اُردو چھاپا پھر فارسی متن بھی اپنے مقدمے کے ساتھ شائع کیا۔ میؔر کے تین قلمی نسخے اب تک دریافت ہوئے ہیں۔ ایک اٹاوہ کے خان بہادر مولوی کے پاس ہے، سوسرا نسخہ لاہور جو پروفیسر محمد سفیع کی ملکیت ہے اور تیسرا نسخہ رام پور جو کتاب خانہ عالیہ رام پور ہے محفوظ ہے۔

میر تقی میؔر کو اپنے معاصرین میں یہ اختیار حاصل ہے کہ انھوں نے اپنے ذاتی حالات اور اپنے عہد کی سیاسی شورش اور انتشار کی داستان کو 'ذکر میر' کے نام سے قلم بند کیا۔ 'بابائے اُردو' ڈاکٹر مولوی علد الحق کے احسانات سے اُردو زبان ہمیشہ زیرِ بار رہے گی کہ انھوں نے کتنے ہی نہایت اہم، نہایت بیش قیمتی متون تلاش کر کے شائع کر دیئے تھے۔ اُن کی بدولت ہی میر کی فارسی سوانح عمری ''ذکرِ میر'' کا متن ہمارے ہاتھوں میں پہنچا۔ 1928ء میں یہ کیات انجمن ترقی اُردو (ہند) اورنگ آباد سے ٹائپ میں چھپی تھی۔ 'ذکر میر' کو نثار احمد فاروقی نے 1957ء میں ''میر کی آپ بیتی'' کے عنوان سے مکتبہ برہان دہلی نے شائع کروایا۔ اس کتاب کا اُردو کی علمی دُنیا میں بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا گیا۔

''ذکرِ میر'' کی اہمیت شخصی بھی ہے اور آفاقی بھی۔ شخصی یہ کہ اس سے میرُ کے اپنے حالات جن سے متعلق کسی شبہے کا امکان نہیں، کم وبیش تفصیل سے معلوم ہو جاتے ہیں۔ چناں چہ میؔر کی زندگی کے حالات ''ذکرِ میر'' سے زیادہ مستند اور کوئی ماخذ نہیں ''تذکرہ نویسیوں نے عام طور پر اور مولانا محمد حسین آزاؔد نے آبِ حیا میں خاص طور پر جو باتیں میؔر سے متعلق لکھی ہیں اُن سے بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ ان کی اصلاح ''ذکرِ میر'' سے ہو جاتی ہے۔ میؔر کے ذاتی حالات کے علاوہ یہ کتاب ہندوستان کی اُس دور کی تاریخ کا بھی بہت اچھا ماخذ ہے۔ میؔر کا زمانہ بڑا پُر آشوب دور رہا ہے۔ بیرونی حملہ آوروں کی تاخت وتاراج اور اندرونی امیروں کی خانہ جنگی اور پیش قدمی نے سلطنتِ مغلیہ کا حال بہت پتلا کر رکھا تھا۔ احمد شاہ درانی کے حملے افغانوں، مرہٹوں اور جاٹوں کی کشمکش وغیرہ۔ یہ تمام حالات نہ صرف میؔر کے سامنے پیش آئے بلکہ وہ خود اس دریائے خون کے شناور رہے۔ اور کتنے معرکوں میں تو بذاتِ خود موجود تھے۔ ان خانہ جنگیوں کی بعض تفصیلات جو انھوں نے قلم بند کی ہیں، وہ کسی دوسری جگہ نہیں ملتیں۔ اس اعتبار سے ''ذکرِ میر''

ایک خاص اہمیت کی حامل ہے۔

ان باتوں کے علاوہ ''ذکرِ میرؔ'' کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں اخلاقی اور روحانی تعلیم ایسے سادہ اور دل کش انداز میں بیان کی گئی ہے کہ اُس سے بہتر بہت کم کسی اور جتہ دیکھنے میں آئی۔ میرؔ ایک اہلِ علم وعرفان خاندان کے نام لیوا تھا۔ اُن کے والد میر علی متقی برگزیدہ درویش اور صاحبِ رُشد وہدایت صوفی تھے۔ میرؔ کے چچا بھی صوفی منش آدمی تھے۔ یہی سبب ہے کہ میرؔ کے والد یا چچا نے جو تعلیم اُنھیں دی، اُس کا لفظ لفظ خلوص سے پُر اور ناخن بدل ہے۔ میرؔ کی شخصیت کی تشکیل میں اس تعلیم کو بڑا عملی دخل ہے۔ چوں کہ یہ باتیں دل سے نکلی ہیں۔ اس لئے دل پر اثر کرتی ہیں۔ میرؔ کا یہ رنگ اُن کی آپ بیتی بعنوان ''ذکرِ میرؔ'' میں بھی جلوہ گر ہے۔

میرؔ نے اپنی آپ بیتی میں نہ صرف دہلی کے بار بار اجڑنے کا ذکر کیا ہے بلکہ لاہور سے آگرہ، متھرا اور فراخ آباد تک کے ہنگاموں اور رعایا کی بدحالی کا بھی مثیہ لکھا ہے۔ کتاب کا جو حصّہ امیر الامراء صمصام الدّولہ کے دربار سے وظیفہ مقرر ہونے اور اُس کے بعد کے حالات و حادثات سے متعلق ہے وہ البتہ تاریخی حقائق ہیں اور دوسری تاریخوں سے زیادہ مستند سمجھے جاسکتے ہیں۔

میر تقی میرؔ کی سوانح ''ذکر میرؔ'' کی ادبی حیثیت بھی مسلّم ہے۔ مولوی عبدالحق میرؔ کی فارسی نثر کو سادہ اور شیریں بتاتے ہیں۔ میرؔ نے اس کتاب کو بڑی محنت سے لکھا ہے جس کا اندازہ اس کے مطالعہ سے ہوجاتا ہے۔ ''ذکرِ میرؔ'' کے الفاظ اور محاورے ''چراغِ ہدایت'' کے سوا کسی دوسری لغت میں مشکل سے ملتے ہیں۔

''ذکرِ میرؔ'' کو میر کی سوانح عمری کہا جاتا ہے مگر اس میں سوانح عمری کم سے کم ہے، یہ تصنیف حوادث اور سانحات سے بھری پڑی ہے۔ میر ایسی سینکڑوں باتیں ہمیں نہیں بتاتے جن کا جواب کسی خودنوشت سوانح عمری سے طلب کیا جاتا ہے۔ انھیں یہ کتاب لکھنے کی تفغیب چراغِ ہدایت سے ملی اور انھوں نے ایرانی محاورہ استعمال کرنے کے شوق میں اس کتاب کی داغ بیل ڈالی، یہ کلاسیکی فارسی، ایرانی محاورے اور سبک ہندی کی آمیزش کا ایک خوشگوار مرکب ہے۔ اس میں میرؔ کا اپنا منفرد اُسلوب ملتا ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے مربوط اور خوب صورت جملے لکھتے ہیں، اُن کی نثر میں بھی اکثر رعایتِ لفظی اور مراعاۃ النظیر کا وہ التزام موجود ہے جو میر کے شاعرانہ اُسلوب کا خاصہ ہے۔ مگر آورد یا تصنّع کا احساس نہیں ہوتا۔ میر کے معاصرین میں کسی دوسرے ہندی نژاد مصنف نے ایسے فارسی اُسلوب میں

کوئی کتاب نہیں لکھی۔ یہ اُسلوب ذکرِ میر اور فیضِ میر میں خوب نمایاں ہے۔ میرؔ کی عبارت میں چھوٹے چھوٹے جملے بلکہ دو لفظی اور سہ لفظی فقروں کے بعد قافیہ آتا ہے جو عجب بہار دکھاتا ہے۔

ادبی اور لسانی حیثیت کے علاوہ ذکرِ میرؔ کی اہمیت ایک اہم تاریخی ماخذ کی بھی ہے۔ اس میں جو واقعات بیان کئے گئے ہیں اُن کا آغاز مارچ 1739ء سے ہوتا ہے اور آخری واقعات مارچ 1789ء کے ہیں اس طرح یہ پورے پچاس برسوں کے جستہ جستہ واقعات پر مشتمل ہے اس میں کچھ واقعات وہ بھی ہیں جن میں میر تقی میرؔ خود شریک ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ میر کے اسفار کی تفصیل بھی اس کتاب میں درج ہے۔ 'ذکرِ میرؔ' میں جو تاریخی واقعات بیان ہوئے ہیں اُن کا تحلیلی اور تقابلی مطالعہ بعض اہم نتائج تک پہنچا سکتا ہے۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ میرؔ کا مقصد اپنے زمانے کی تاریخ لکھنا نہیں تھا وہ خود جن خوادث کی لپیٹ میں آئے اُن کا بیان کرنے سے اُس زمانے کے تاریخی وقائع سامنے آ گئے ہیں۔

میرؔ کی سوانح عمری کے مطالعہ سے اُن کی کسی گروہ بندی کا بھی اندازہ نہیں ہوتا۔ بلکہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے میرؔ کی مدد کی ہے۔ ایرانی اور تورانی گروہ کی بھی انھیں یکساں ہمدردی حاصل رہی ہے۔ 'ذکرِ میرؔ' فرمایشی یا درباری تاریخ بھی نہیں ہے۔ اس لئے یہاں جن واقعات کا بیان ہوا ہے وہ کسی عصبیت اور جانب داری سے بڑی حد تک پاک ہے۔

نفسیاتی اعتبار سے بھی اس خودنوشت کا مطالعہ دل چسپی سے خالی نہیں۔ جب میرؔ دوسروں کا ذکر کرتے ہیں تو خود ان کے خلوت کدۂ ذات کا حجاب بھی اُٹھ جاتا ہے۔ خوش گشتہ تمناؤں اور چھپی ہوئی آرزوؤں کا ذکر ان کے ذہن اور دماغ کے بہت سے گوشوں کو بے نقاب کر دیتا ہے اور اس طرح اُن کے اسیال وعواطف کے بہت سے سربستہ راز کھل جاتے ہیں۔ میر خود پوشی اور خودنمائی کے درمیان برابر جھولتے رہتے ہیں۔ اس لئے محمد حسین، خان آرزُو، میر جعفر، عظیم آبادی، سعادت امروہوی، جاجا جگل کشور، راجا ناگرمل اور نواب آصف الدولہ وغیرہ کے متعلق ان کے بیانات دل چسپی سے خالی نہیں ہے۔ دوسروں کی سیرت نگاری کی کوشش میں خود ان کی سیرت کے بھی بہت سے پہلو بے نقاب ہو گئے ہیں۔

'ذکرِ میرؔ' سے میر کے مذہبی معتقدات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی پرورش ایسے خاندان میں ہوئی تھی جو

صوفیوں کا ملجا ماوا اور رشد و ہدایت میں کافی مشہور تھا۔ ''ذکرِ میرؔ' اور 'فیضِ میر'' دونوں تذکرے اس کے گواہ ہیں۔ اس عجیب وغریب تاریخ پس منظر میں میرؔ کی حیثیت درویش زادے کی بھی ہے، طالب علم کی بھی، عاشق کی بھی، شاعر کی بھی مصاحب کی بھی اور ایک ایلچی کی بھی۔

مختصراً یہ کہ میرؔ نے اپنی آپ بیتی میں اپنی زندگی کی تمام یادوں کو سمیٹ لیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اُس دور کے نامساعدہ حالات کی عکاسی بھی کی ہے۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ 'ذکرِ میرؔ' صرف ان کی آپ بیتی ہی نہیں بلکہ وہ ان ہزاروں لاکھوں تباہ و برباد انسانوں کی آپ بیتی ہے جو اٹھاہویں صدی میں حیرت وحسرت کا تماشہ بن چکے تھے۔ ان معنوں میں میرؔ کی یہ آپ بیتی اس لئے بھی اہم ہے کہ اس میں وہ عہد سانس لے رہا ہے جو تاریخ بن چکا ہے۔ اس تاریخ میں بادشاہ سے فقیر تک ہر وہ کردار موجود ہے جسے وقت کی سفاکیوں نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔ لیکن میرؔ نے اسے ایک قطرۂ خون میں سمیٹ کر ایک ایسی آپ بیتی بنا دیا جس کا مرکزی کردار وہ خود ہیں۔ ذکرِ میرؔ کا اندازِ بیان موثر، دل آویز اور بے باکانہ ہے۔ قافیوں کا اہتمام ہے۔ لیکن اس سے روانی میں فرق نہیں آیا۔ جملوں کی ساخت پختہ اور بے رخنہ ہے۔ ان کی نثر، غالب کی فارسی نثر سے سلاست اور سادگی میں زیادہ اور رخشندگی و شگفتگی میں کم ہے اور یہ رائے مجموعی حیثیت سے صحیح ہے۔ چھوٹی بحر کی غزلوں کی طرح ان کا کمال مرقع نگاری میں نظر آتا ہے۔ جہاں انھوں نے چھوٹے چھوٹے فقروں اور اشاروں میں جہانِ معنی کو پیش کر دیا ہے۔ میرؔ کی یہ خودنوشت رہتی دُنیا تک اُن کی یادگار رہے گی۔

سوانح نگاری سے متعلق میرؔ کی دوسری تصنیف ''نکات الشعراء'' ہے میرؔ نے یہ تذکرہ 1752ء میں بہ عہد احمد شاہ لکھا ہے۔ اس میں شعراء کے حالات زیادہ تفصیل سے نہیں ہیں لیکن جو باتیں معاصر شعراء کے متعلق درج ہیں وہ اختصار کے باوجود قابلِ قدر ہیں۔ اس میں میرؔ نے اُس دور کے 103 شعراء کے مفصّل حالات قلم بند کئے ہیں۔ یہ تذکرہ حضرت امیر خسرو سے شروع ہوتا ہے اور میرؔ کے حالات پر ختم ہو جاتا ہے۔ نکات الشعراء یہاں تنقیدی و تاریخی اہمیت کا حامل ہے وہیں اس کی سوانحی اہمیت بھی مسلّم ہے۔ اس کی سوانحی اہمیت پر مولوی عبدالحق یوں فرماتے ہیں کہ اس میں عموماً اور اکثر شعراء کے کلام پر منصفانہ اور بے باکانہ تنقید پائی جاتی ہے۔

''نکات الشعراء'' اگرچہ کوئی تاریخی کتاب نہیں ہے تاہم اس میں یہ التزام کیا گیا ہے کہ جو واقعہ حقیقی ہو اُسی کو

رقم کیا جائے۔ جن شعراء کا حال معلوم نہ ہو سکا وہاں میؔر نے صاف لکھ دیا ہے کہ اُن کا حال معلوم نہیں ہے۔ تمام تذکرے میں ایک بھی لفظ ایسا نہیں معلوم ہوتا جس سے میؔر کی خود بینی، خود پسندی یا بد دیانتی ظاہر ہو۔ برخلاف اس کے اپنا ذکر انھوں نے ہر جگہ منکرانہ لہجے میں کیا ہے۔

''نکات الشعراء'' کے ذریعے نہ صرف میؔر کی زندگی کے حالات اور شخصیت کے بعض اہم اجزا سامنے آتے ہیں بلکہ جن شعراء کا ذکر انھوں نے کیا ہے اُن پر اور اُن کے ماحول پر بھی ایسی روشنی پڑتی ہے کہ ہمیں اُن کی سوانح نگاری اور سماجی شعور کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ، میؔر خاکہ بناتے وقت مناسب الفاظ پر غیر معمولی قدرت کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ ان کے الفاظ جامع اور پُر معنی ہوتے ہیں۔ میؔر نے نکات الشعراء میں ایک سو سے زائد شعراء کے قلمی چہرے پیش کئے ہیں۔ لیکن ان رنگا رنگ صورتوں میں خود اُن کے چہرے کی اصل جھلک بھی موجود ہے۔ اس جھلک میں جو باتیں زیادہ نمایاں طور پر سامنے آئی ہیں وہ ان کے مزاج کی شگفتگی اور خوش خلقی ہے۔

ایک قابلِ ذکر بات یہ بھی ہے کہ نکات الشعراء میں میؔر کا ذکر براہ راست نہ ہوتے ہوئے بھی پورے تذکرے پر حاوی نظر آتا ہے۔ انھوں نے اپنا جو طویل انتخاب شامل کیا ہے اُس سے اُن کے شعری مذاق کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے۔ اس انتخاب سے بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ میؔر کو جتنی دسترس زیاب اور شاعری پر تھی اُتنی ہی شعر فہمی پر بھی تھی۔ علاوہ ازیں معاصر شعراء کی اصلاح سے بھی ان کی تنقیدی بصیرت اور شعر شناسی کا احساس ہو جاتا ہے۔

غرض 'نکات الشعراء' کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ میر تقی میؔر سوانح نگاری میں بھی اپنا ایک الگ مقام رکھتے ہیں۔ باوجود اختصار کے نکات الشعراء میں پیش کردہ قلمی چہرے اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں اور مکمل چہرے نظر آتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس سے میؔر کے حالات اور خاص طور پر اُن کے کلام کی عظمت کا احساس بھی ہو جاتا ہے۔

کتب برائے مُطالعہ :

۱۔ میر کی آپ بیتی از نثار احمد فاروقی

۲۔ افکارِ میر از ایم۔ حبیب خان

میر تقی میرؔ کی زِندگی کے اہم واقعات

سبق ۱٦

مقاصد :

اس باب میں آپ میر تقی میرؔ کی زندگی کے اہم واقعات سے متعلق جانکاری حاصل کریں گے۔

اس باب کے مطالعہ سے میرؔ کی زندگی اور اُن کے رنج واندوہ کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

تمہید :

اٹھارہویں صدی کے اُردو شعراء میں میر تقی میرؔ کا نام خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اُردو کے طالب علم کے لئے لازمی ہے کہ وہ اُن کی شاعری اور نثر دونوں کا مطالعہ کرے اور اُن کو سمجھے۔ تاہم اُن کے کلام اور نثری تصانیف کو سمجھنے کے لئے از حد ضروری ہے کہ اُن کے دور کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی حالات کو سمجھا جائے۔ میرؔ کی زندگی کے حالات اور اُن کے عہد کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک پُر آشوب دور تھا جس نے میر تقی میرؔ کو بھی غم واندوہ کی تصویر بنا دیا۔

میر تقی میرؔ کی زِندگی کے اہم واقعات :

میرؔ کے جدّ اعلیٰ حجاز سے تلاشِ روزگار میں دکنی ہندوستان میں وارد ہوئے تھے۔ اُن کے خاندان کے کچھ لوگ کسی وقت اکبرآباد آ گئے جو اُس زمانے کی مغل حکومت کا دارالسلطنت تھا۔ میرؔ کے دادا اُسی خاندان سے تھے جنھیں فوج میں ملازمت مل گئی تھی۔ موصوف پچاس برس کی عمر میں ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اُن کے دو بیٹے تھے۔ بڑے بیٹے کو جنون کا عارضہ لاحق تھا اور وہ جوانی میں ہی وفات پا گئے۔ چھوٹے بیٹے کا نام محمد علی تھا جو آگے چل کر اپنے زہد و تقویٰ کی بنا پر علی متقی کے خطاب سے موسوم ہوئے۔ انھوں نے علوم متداولہ کی تعلیم شاہ کلیم اللہ اکبرآبادی سے حاصل

کی۔ اُن کی پہلی زوجہ دہلی کے مشہور شاعر اور عالم، سراج الدین خان آرزوؔ کی بڑی بہن تھیں جن کے بطن سے ایک بیٹا پیدا ہوا، اس کا نام حافظ محمد حسن تھا۔ دوسری بیوی سے علی متقی کے ہاں تین اولادیں ہوئیں۔ دو لڑکے محمد تقی اور محمد رضی اور ایک بیٹی، جو بڑی ہو کر محمد حسین کلیم کو بیاہی گئیں۔ علی متقی کے بڑے بیٹے محمد تقی ہی اُردو غزل کے عظیم شاعر میر تقی میرؔ ہیں۔ جن کی زندگی کے چند اہم واقعات ذیل میں پیش کیئے جا رہے ہیں۔

میرؔ کی ولادت :

میر تقی میرؔ 20 ستمبر 1722ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔ میر کی والدہ کا اُن کی کم سنی میں ہی انتقال ہو گیا۔ میرؔ کے والد علی متقی ایک مشہور خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ جن سے مختلف اوقات میں کرامات بھی سرزد ہوئیں۔ وہ ہمیشہ یادِ الٰہی میں مصروف رہتے تھے۔ حق تعالیٰ نے انھیں ہمیشہ ذلّت سے محفوظ رکھا۔ جب کبھی اُن کی طبعیت شگفتہ ہوئی تو میر تقی میرؔ سے فرمایا کرتے کہ بیٹا عشق اختیار کرو کہ عشق ہی اس کا کارخانہ پر مسلّط ہے۔ اگر عشق نہ ہوتا تو یہ تمام نظاک درہم برہم ہو جاتا۔ بے عشق کے زندگی وبال ہے اور عشق میں دل کھونا اصل کمال ہے، عشق ہی بناتا ہے اور عشق ہی بگاڑتا ہے۔ چناں چہ والدِ بزرگوار کی ان ہی نصیحتوں کے زیرِ سایہ میرؔ کی پرورش ہوئی۔ والد کے ان اقوال کا میرؔ کی زندگی پر گہرا اثر پڑا اور اُن کے کلام میں ان خلایات کی بازگشت موجود ہے۔

عشق پہ عشق ہے جہاں دیکھو — سارے عالم میں بھر دیا ہے عشق
عشق معشوق، عشق عاشق ہے — یعنی اپنا ہی مبتلا ہے عشق

میرؔ کی تربیت :

سید امان اللہ علی متقی کے مُرید تھے۔ اُن کو علی متقی سے بڑی قربت تھی۔ اُن کی تربیت اور نگاہِ کشف کی بدولت ہی سید امان اللہ ''فقیر کامل'' کے درجے پر پہنچے تھے۔ درویش صفت علی متقی نے میرؔ کو سات برس کی عمر میں تربیت کے لئے امان اللہ کے سپرد کر دیا اور میرؔ اُن سے قرآن شریف پڑھنے لگے۔ میرؔ اُن کو عم بزرگوار کہتے اور ہر وقت ان کے پاس رہتے۔ میرؔ نے ان کی صحبت سے بڑا فیض اُٹھایا ہے۔ میرؔ سید امان اللہ کے ساتھ احسان اللہ، بایزید اور اسد اللہ وغیرہ درویشوں کی صحبتوں میں بھی شریک ہوا کرتے۔ ابھی میرؔ دس برس کے ہی ہوئے تھے کہ اُن سے بے حد محبت

کرنے والا منہ بولا چچا امان اللہ ملکِ عدم کو سدھار گئے۔ لیکن میؔر کی زندگی پر امان اللہ کی صحبتوں کا بڑا اثر پڑا اور ان میں بچپن ہی سے دردمندی اور قلندری کی شان پیدا ہوگئی جس کا رس ان کے کلام میں ہمیشہ باقی رہا۔

میؔر کے والد کا انتقال :

میؔر کے والد کو اپنے عزیز از جان مرید امان اللہ کی دائمی جُدائی کا اتنا رنج ہوا کہ سال بھر کے اندر اندر ہی وہ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ علی متقی کی تاریخ وفات 18 دسمبر 1733ء ہے۔ میؔر اس وقت بمشکل گیارہ برس کے تھے۔ اس طرح میؔر کو لڑکپن ہی میں یتیمی کا داغ سہنا پڑا۔ اس نوعمری میں ہی اُن کو اپنے علاوہ چھوٹے بھائی محمد رضی اور چھوٹی بہن کا پیٹ بھرنے کی فکر لاحق ہوئی۔ کیونکہ اُن کے سوتیلے بھائی حافظ محمد حسن نے ان لوگوں سے قطع تعلق کر رکھا تھا۔ اور باپ سے ترکے میں ملنے والی تقریباً تین سو کتابوں میں سے انھیں ایک بھی نہیں دی تھی۔ امان اللہ کا ایک مرید، مکمل خاں پانچ سو روپے کی ایک ہنڈی علی متقی کی وفات کے وقت لایا تھا جس سے اُن کی تکفین ممکن ہوسکی۔

باپ کے انتقال کے بعد میؔر پر مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ لیکن اس لاوارث اور خوددار بچے نے کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ آسمان کی بے مروتی دیکھی، زمانے کے ستم جھیلے۔ اب اپنے ہی ہاتھ کے سوا اور کسی کا ہاتھ میؔر کے سر پر نہ تھا۔

اپنا ہی ہاتھ سر پہ رہا اپنے یاں سدا
مشفق کوئی نہیں ہے، کوئی مہرباں نہیں

تلاشِ معاش :

یتیم ہونے کے بعد میؔر آگرہ اور اُس کے گرد و نواح میں روزگار تلاش کرنے لگے لیکن ناکامی ہاتھ آئی۔ مجبور ہو کر 1734ء میں وہ تلاشِ معاش کی غرض سے دہلی کی طرف روانہ ہوئے۔ یہاں پہنچ کر فکرِ روزگار نے انھیں بہت سرگرداں اور پریشان رکھا۔ کچھ مدّت بعد ان کی ملاقات خواجہ محمد باسط سے ہوگئی جو اُن کی پریدان حالی پر ترس کھا کر انھیں اپنے چچا صمصام الدولہ کی خدمت میں لے گئے موصوف محمد علی متقی سے عقیدت رکھتے تھے۔ چناں چہ انھوں میر تقی میؔر کو ایک روپیہ یومیہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ اب میر دہلی سے واپس آگرہ چلے آئے اور اسی ایک روپیہ یومیہ پر اپنے

چھوٹے بھائی اور چھوٹی بہن کے ساتھ گزر بسر کرنے لگے لیکن فلک کج افتاد نے جلد ہی یہ سہولت بھی میرؔ سے چھین لی۔ چونکہ صمصام الدولہ نادر شاہ سے جنگ میں زخمی ہو کر راہی ملکِ عدم ہو گئے اور میرؔ کو ملنے والا وظیفہ 1739ء میں بند ہو گیا۔ اس طرح میرؔ ایک مرتبہ پھر بے یار و مددگار ہو گئے۔

دہلی کا سفر :

اب کچھ دیر پھر آگرہ میں روزگار کی تلاش کی لیکن مایوسی ہاتھ آئی اور میرؔ پھر دہلی کی طرف چل نکلے۔ اس بار دہلی میں محمد تقی نے اپنے سوتیلے ماموں سراج الدین علی خاں آرزؔو کے گھر میں قیام کیا۔ سراج الدین علی خان اپنے وقت کے مشہور عالم اور شاعر تھے۔ میرؔ اگلے سات برس تک اُن کے ہاں مقیم رہے اور خورد و نوش کے علاوہ ان کے زیرِ سایہ تعلیم و تربیت کے مراحل سے بھی گُزرے۔

خان آرزؔو کی بدسلوکی :

سراج الدین خان آرزؔو کو اُن کے بھانجے حافظ محمد حسن جو میرؔ کے سوتیلے بھائی تھے نے ورغلایا کہ میر تقی میرؔ فتنۂ روزگار ہے اس کی تربیت ہرگز نہ کرنا۔ اپنے بھانجے کی عداوت دیکھ کر سراج الدین میرؔ کا بُرا چاہنے لگے اور میر کے ساتھ دشمنوں کا سا برتاؤ کرنے لگے۔ غرض اس بدسلوکی سے میرؔ کو اس قدر رنج اور تکلیف ہوئی کہ وہ دروازہ بند کئے کوٹھری میں پڑے رہتے اور رنج و غم میں دن رات کڑھتے رہتے۔

جنون :

سراج الدین کی عداوت کے بعد میرؔ کی حالت پاگل پنے کو پہنچ گئی۔ اُن کے مزاج میں وحشت پیدا ہو گئی۔ وہ جس حجرے میں رہتے تھے اس کا دروازہ بند کر کے ہجومِ غم میں تنہا بیٹھے رہتے۔ غم اور غصّہ کی وجہ سے میرؔ پر جنون کی سی حالت طاری ہو گئی۔ ان کے ذہن میں جو الجھاؤ یا پیچیدگی، جنسی محبت کے دبانے سے پیدس ہو گئی تھی وہ جیتے جی ختم نہ ہو سکی بلکہ اس نے نفس کے نہاں خانوں پر قبضہ کر لیا اور تخیل کی گرم رفتاری نے ایک وہمی صورت یا خیالی پیکر چاند میں دیکھنا شروع کر دیا۔ چار مہینے تک وہ گلِ شب افروز نت نئے گل کھلاتا رہا۔ موسم بہار آیا جنون کے داغ اور بھی گہرے ہو گئے۔ بس ہر وقت وہی خیالی صورت نظر میں رہتی۔ بڑے علاج معالجے کے بعد جنون کی شدّت میں کمی

آئی اور طبعیت بحال ہوئی۔ مثنوی 'خواب و خیال' میں جو تصویر انھوں نے پیش کی ہے اس میں جنسی عوامل کو پورا دخل ہے اور جو آرزُو حقیقت کی بے رحم دُنیا میں پوری نہ ہو سکی تھی۔ اُس نے تخیل کی آسان دُنیا میں پورے ہونے کی راہ نکال لی۔

شعر گوئی :

میرؔ کی شعر گوئی کا آغاز خان آرزُوؔ کے ہاں رہائش کے دوران اور انھیں کی تحریک و تربیت کے زیرِ اثر ہوا لیکن بعد میں پیدا شُدہ کبیدگی کے باعث میرؔ نے کُھل کر ان سے استفادے اور کسبِ فیض کرنے کا اعتراف نہیں کیا۔ قرائین کے مطابق میرؔ کی شعر گوئی کی ابتداء 1740ء کے آس پاس ہوئی۔ خان آرزُوؔ کی صحبت و تربیت اور وہی صلاحیت کے زیرِ اثر میر تقی میرؔ نے بہت کم عرصے میں خاصی مشق بہم پہنچائی اور اپنے عہد کے مقامی شاعروں میں قدر کی نگاہ دیکھے جانے لگے۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ میرؔ نے جعفر عظیم آبادی سے بھی درس لیا اور شعر کہنے کی ترغیب انھیں سعادت امروہوی نے دلائی۔

رعایت علی خان کی مصاحبت :

میر تقی میرؔ جب خان آرزُوؔ کی اقامت ترک کر کے حوض قاضی چلے گئے تو وہاں علیم اللہ خان اُن پر مہربان ہو کر رعایت خان کے پاس لے گیا جو قمر الدین خان وزیر کے بھانجے اور مالوہ کے صوبیدار کے بیٹے تھے۔ نہایت متمول و بااثر آدمی تھے انھوں نے میرؔ کو اپنا مصاحب مقرر کر لیا۔ یہ 1748ء کے آس پاس کا زمانہ تھا۔ رعایت خان کے ماموں وزیر قمر الدین خان اس زمانے میں احمد شاہ ابدالی سے جنگ آزما تھے۔ رعایت خان کے ساتھ میرؔ بھی ان کے لشکر میں شامل تھے۔ قمر الدین لڑتے ہوئے سخت زخمی ہو گئے اور اس نتیجے میں اُن کا انتقال ہو گیا۔ چند دنوں بعد بادشاہ احمد شاہ تخت نشین ہوا اور اُس نے صفدر جنگ کو اپنا وزیر مقرر کیا۔ اب رعایت خان اُن کے ہمراہ دہلی منتقل ہو گئے اور اُن کے ساتھ میرؔ بھی پھر دہلی پہنچ گئے۔ میرؔ نے رعایت خان کے ساتھ اجمیر کا سفر بھی کیا۔ اس سفر میں انھوں نے حضرت معین الدین چشتی کے مزار کی زیارت کی۔ جب رعایت خان نے بخت سنگھ کی رفاقت ترک کر دی تو میرؔ کے ساتھ دہلی واپس آ گئے۔ اس کے بعد میرؔ زیادہ دنوں تک رعایت خان کے ساتھ نہیں رہ سکے۔ کسی بات پر خفا ہو کر میرؔ

نے رعایت خان کی مصاحبت 1749ء میں ترک کردی۔

نواب بہادر جاوید خان کی ملازمت :

رعایت خان کی ملازمت ترک کرنے کے کچھ دنوں بعد میؔر نے نواب بہادر جاوید خان، خواجہ سرا کی ملازمت اختیار کرلی۔ یہ ایک طرح کی اعزازی نوکری تھی۔ میؔر کو عام سپاہیوں کی طرح گھوڑا رکھنے اور کسی طرح کا کام کرنے سے معاف رکھا گیا تھا۔ محض تنخواہ وصول کرتے تھے۔ چونکہ اس زمانے میں میؔر کو قدرے فراغت اور فرصت نصیب تھی اس لئے انھوں نے اسی اثناء میں اپنا تذکرۂ شعرائے اُردو، تصنیف کیا جس کا نام ''نکات الشعراء'' ہے۔ صفدر جنگ نے جاوید خان خواجہ سرا سے ناراض ہو کر اُسے قتل کرادیا تو میؔر پھر بے روزگار ہوگئے۔

رائے بہادر سنگھ کی قدردانی :

1772ء میں رائے بہادر بادشاہ کے حلیف مرہٹے اُسے لے کر دہلی آئے اور مجبور کیا کہ نجیب الدولہ کے بیٹے صابطہ خان پر چڑھائی کی جائے۔ سکرتال پر جہاں ضابطہ خان صف بند تھا حملہ ہوا۔ ضابطہ خان بھاگ گیا اور مرہٹوں نے اُس کے مال واسباب پر قبضہ کرلیا۔ اس حملہ آور شاہی لشکر میں ناگرمل کا بیٹا رائے بہادر سنگھ اور میر تقی میؔر بھی شریک تھے۔ چونکہ مرہٹے سارا مال واسباب لے گئے تھے اس لئے رائے بہادر سنگھ کی مالی حالت بھی خستہ ہوگئی اور میر تقی میؔر تو کوڑیوں تک کے محتاج ہوگئے۔

میر کی عُسرت اور گوشہ نشینی :

دہلی میں رہتے ہوئے عسرت اور تنگ دستی کی کوئی تکلیف ایسی نہیں تھی جس سے میر دوچار نہ ہوئے۔ دہلی میں سخت تنگ دستی اور عُسرت کی وجہ سے میؔر گوشہ نشین سے ہوگئے۔ اب دوسروں کی امداد پر ہی گزارا ہوتا تھا۔ بادشاہ جن کی حکومت دہلی سے پالم تک رہ گئی تھی، کبھی کبھار کچھ بھیج دیتے تھے۔ اب میر پچاس برس کے ہو چکے تھے اور شب و روز کا مشغلہ صرف شاعری ہوگئی تھی۔ سوؔدا دہلی چھوڑ چکے تھے اور لکھنؤ میں مقیم تھے۔ میؔر کی آپ بیتی سے اندازہ ہوتا ہے کہ والد کی وفات سے پہلے اُن کی درویشی کے طفیل میؔر نے تنگی میں گزراوقات کی اور اُن کے انتقال کے بعد پچاس برس کی ادھیڑ عمر ہونے تک میؔر کو زندگی میں بادِ بہار کے جھونکے چند ایک ہی نصیب ہوئے۔ وگرنہ اُن کی تمام عمر

پریشانی، غریبی اور محرومیوں کے صحرا میں جھلستے ہوئے بیتی۔ اپنے ارد گرد انھوں نے لوٹ کھسوٹ، تباہی، قتل و غارتگری اور خانہ جنگیاں ہی دیکھیں۔ غرض 1772ء سے 1782ء تک میرؔ ایسے ہی عالم میں دہلی رہے اور ساری تباہی اپنی آنکھوں سے دیکھی۔

میرؔ کا سفرِ لکھنؤ :

لکھنؤ اُس دور میں ایک آسودہ مقام تھا۔ میرؔ کے دل میں لکھنؤ جا بسنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ میرؔ کی قسمت اب کچھ اس طرح مہربان ہوئی کہ 1781ء میں اودھ کے نواب آصف الدولہ کو خواہش ہوئی کہ میر تقی میرؔ کو لکھنؤ بلایا جائے تا کہ سوداؔ کی وفات سے پیدا ہونے والی کمی کا ازالہ ہو سکے۔ چناں چہ نواب کا پروانہ ملتے ہی میرؔ نے لکھنؤ کا ارادہ باندھا اور دہلی کے خرابے کو خیر باد کہا۔ لکھنؤ جانے کے بعد نواب نے اُن کو اپنی ملازمت میں لے لیا۔ تنخواہ تین سو روپے ماہانہ مقرر ہوئی۔ غرض 1782ء میں میر تقی میرؔ لکھنؤ میں مقیم ہو گئے۔ جہاں میر نے اکتیس برس آرام سے گزارے۔

میر تقی میرؔ کی وفات :

میرؔ کا انتقال 20 ستمبر 1810ء کو جمعہ کے دِن شام کو ہوا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر نوّے برس کی تھی۔ دوسرے دن دو پہر کے وقت لکھنؤ کے اُس وقت کے مشہور قبرستان اکھاڑہ بھیم راؤ میں میرؔ کو دفن کیا گیا۔ لیکن اب وہاں بہت سی قبروں کے نشان مٹ گئے ہیں۔ میرؔ کو شاید آئندہ باتوں کی خبر تھی یہ شعر بالکل حسبِ حال ہے۔

مت تربتِ میرؔ کو مٹاؤ   رہنے دو غریب کا نشاں تو

میر تقی میرؔ کے متعدد اسفار :

۱۔	آگرہ سے دہلی (پہلی بار)	1734ء
۲۔	آگرہ سے دہلی (دوسری بار)	1741ء
۳۔	دہلی سے سرہند	1748ء

۴۔ دہلی سے پُشکر (راجستھان) 1749ء

۵۔ پُشکر سے اجمیر 1749ء

۶۔ دہلی سے فرخ آباد 1750ء

۷۔ دہلی سے سکندر آباد 1754ء

۸۔ دہلی سے آگرہ 1762ء

۹۔ کاماں کا سفر 1771ء

۱۰۔ دہلی سے سکرتال 1771ء

۱۱۔ دہلی سے لکھنؤ 1782ء

کتب برائے مُطالعہ :

۱۔ میرتقی میرؔ حیات اور شاعری از خواجہ احمد فاروقی

۲۔ میر کی آپ بیتی از نِثار احمد فاروقی

۳۔ افکارِ میر از ایم۔ حبیب خان

۴۔ نِکات الشعراء (اُردو ترجمہ) از مولوی عبدالحق

ASSIGNMENT QUESTIONS

Total Marks : 20

Note: Attempt all the Questions

Each Assignment Contains 10 Marks.

مندرجہ ذیل دونوں سوالات کے جوابات لکھنے لازمی ہیں

سوال نمبر۱۔ میرؔ کی حالات زندگی اور غزل گوئی پر تفصیل کے ساتھ لکھیں

سوال نمبر۲۔ میرؔ کی تذکرہ نگاری پر بحث کیجئے۔